خلوت
از قلم داہم نذیر

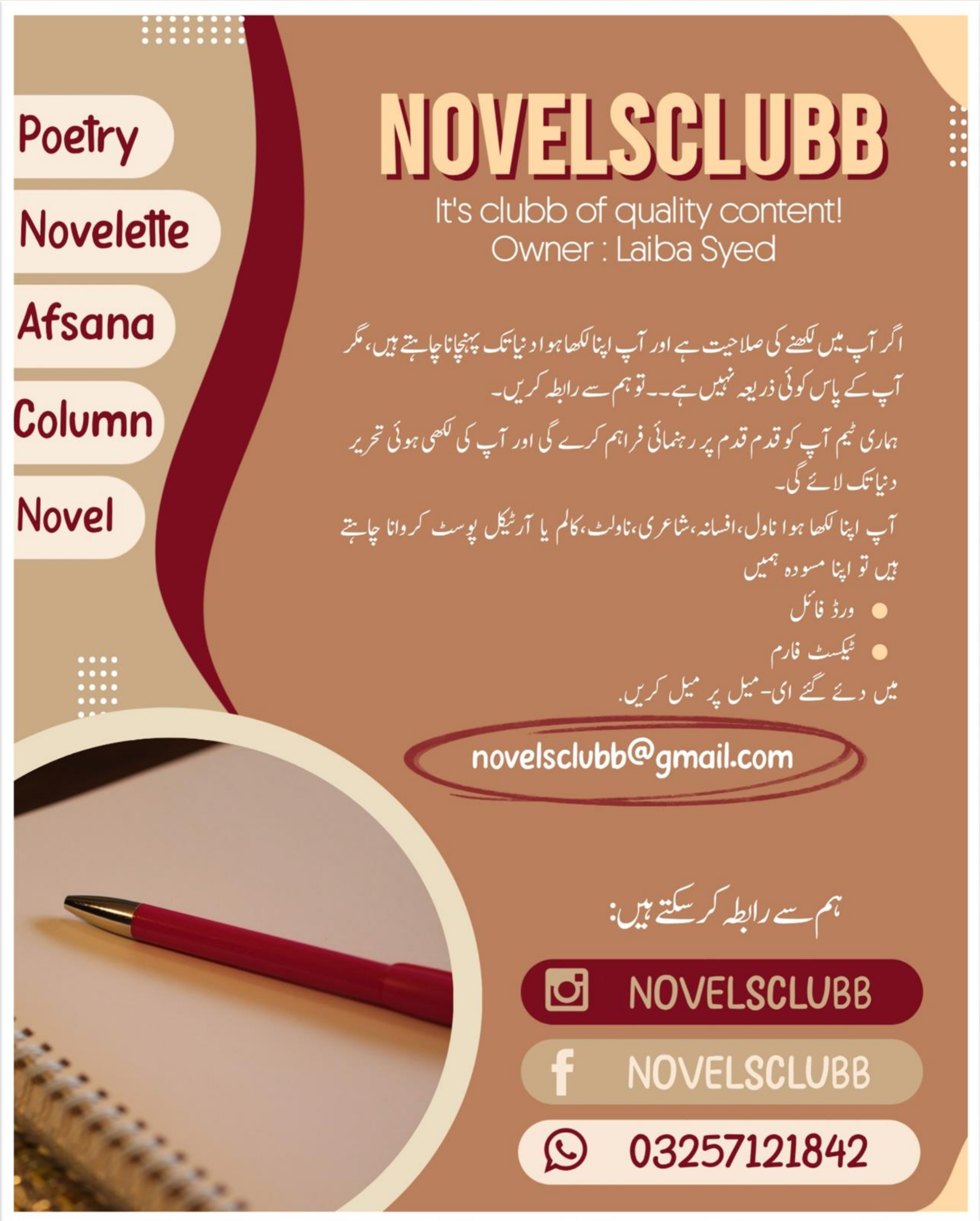
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

خلوت

از قلم

داہم نذیر

Clubb of Quality Content!

پیشِ لفظ

ہم سب کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں جو نہ گزرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں نہ آنے والوں میں۔ وہ لمحے بس رکے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا ہم کب ان کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہمارے اردگرد کی آوازیں معدوم ہونے لگتی ہیں۔ ہجوم پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ گفتگوئیں ساکت ہوجاتی ہیں۔ اور پھر ہم پہلی بار اپنی ہی صدا سننے لگتے ہیں۔

اسی لمحے خلوت آغاز لیتی ہے۔ وہی خلوت جسے ہم تنہائی، گوشہ نشینی یا عزلت کے معنوں میں لیتے ہیں۔

میرے قلم سے لکھی جانے والی یہ تحریر اسی خلوت کی پہلی چاپ ہے۔ یہ نہ تو کوئی مکمل داستان ہے اور نہ ہی روایتی انجام کی تلاش میں بھٹکتی کوئی کہانی۔ یہ محض ایک عکس ہے۔ کبھی صاف، کبھی دھندلایا ہوا۔ مزید برآں یہ تحریر کوئی تیز رفتاری کے مفہوم میں بسنے والی نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ خاموشی کے اندر چھپی ایک پکار ہے۔

اگر آپ نے کبھی خود کو مکمل سکوت میں پایا ہو تو یہ کتاب آپ کے لیے خاموشی کی ایک دستک ہے۔ اس کا ہر صفحہ آپ کے اندر کے کسی ان کہے سوال کو چھوئے گا۔ شاید کسی بے نام درد کو،شاید کسی ایسے لمحے کو جو آپ نے کبھی محسوس تو کیا ہو مگر بیان نہیں کر سکے۔

اس تحریر کی سطریں میرے قلم سے نکلی ضرور ہیں مگر ان کی اصل صدا آپ ہی کے دل سے آئی ہے۔ میں نے محض ان کیفیات کو لفظوں کی صورت دی ہے جنہیں آپ برسوں سے محسوس کر رہے تھے۔ مگر کبھی نام نہیں دے سکے۔ یہ کتاب آپ سے کچھ نہیں مانگے گی۔ نہ فوری فہم،نہ گہرا ردعمل۔

اگر آپ اس سفر کے دوران کچھ نہ سمجھ سکیں تو بھی یہ تحریر مکمل ہے۔ کیونکہ خلوت کبھی پہلی بار میں پوری طرح نہیں کھلتی۔ یہ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے پردے ہٹاتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ اندر کا دروازہ وا ہو جاتا ہے۔جہاں کوئی بہت خاموشی سے صرف آپ کی واپسی کا منتظر ہوتا ہے۔

میرے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہے۔ لیکن فلحال یہیں اختتام کرتے ہیں۔ باقی کی باتیں تو خیر سے خلوت کی اس جہان گردی میں وقت کے ساتھ ہوتی ہی رہیں گی۔ تو چلیں اس سفر کا

آغاز کرتے ہیں۔یہ تحریر اب آپ کے حوالے ہے۔ جو سمجھ آئے،وہ آپ کا حصہ ہے۔اور جو نہ سمجھ آئے۔وہ شاید ابھی آپ کے اندر بیدار ہونا باقی ہے۔

اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیے گا۔اللہ حافظ۔

آپ کا مصنف

داہم نذیر

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

نقطہ آغاز

تمکین

قسط نمبر:۱

رات کی سیاہی وہ کچھ دکھادیتی ہے جو دن کی پوری روشنی کے باوجود بھی چھپارہ جاتا ہے۔

Clubb of Quality Content!

آسمان پر سیاہی کی گہری چادر تنی ہوئی تھی اور رات خاموشی کے سائے میں اپنا رنگ جما چکی تھی۔ ہوا میں عجیب سی سستی اور ٹھنڈک تھی جیسے وقت نے سردی سے سہم کر چلنا چھوڑ دیا ہو۔ چاند بدلیوں کے پیچھے چھپا کسی راز کی مانند خاموش تھا اور نیچے شہر لحافوں میں دبکا سو رہا تھا۔ ایک ایسی نیند جو محض جسموں کی ہوتی ہے۔ روحیں تو جاگ رہی تھیں۔ قدیم عمارت کی راہداری میں سناٹا سانس لے رہا تھا اور دیواروں پر لٹکے سائے لمبے ہوتے جارہے تھے۔

ایسے میں سب کچھ ساکت تھا۔

مگر وہ نہیں۔ وہ.... جس کے اندر کسی ان کہی تڑپ کا طوفان پل رہا تھا۔ وہ اس سکوت میں ایک حرکت تھا۔ ایک فیصلہ۔ ایک انجام۔

اس سناٹے میں جب ہر سو سرد ہواؤں کا عالم تھا، وہ اپنے بھاری قدموں سمیت اس راہداری کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں تہہ خانے کا دروازہ موجود تھا۔ سانس کی بھاپ اس کے ہونٹوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ سرد پتھروں سے بنی دیواریں اس کے قدموں کی چاپ سے گونج رہی تھیں اور خاموش فضا اس کے اشتعال کا بوجھ محسوس کر رہی تھی۔

سارا دن وہ چہرے پر مسکراہٹ کا نقاب اوڑھے دنیا کے سامنے خود کو سنوارے رکھتا تھا۔ لیکن رات کی اس یخ تاریکی میں جب تنہائی اسے آ گھیرتی تو وہ سارے ناسور جو اس کے دل میں پلتے تھے۔ جاگتے، اور اس کے وجود کو اندر سے سلگانے لگتے۔

روشنی میں اس کا چہرہ سنجیدہ، سخت اور بے رحم دکھائی دیتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور ماتھے پر سلوٹوں کا جال تن چکا تھا۔

اس کے قدموں کی دھمک دور سے بھی سنی جا سکتی تھی جسے محسوس کرتے ہی دروازے پر پہرہ دیتے مرد نے بے ساختہ ہی حلق تر کیا۔

"دروازہ کھولو"

وہ تلوار جو اس کے سر پر لٹک رہی تھی، اس آواز پر جیسے سیدھا اس کی گردن پر ضرب لگا کر اسے لرزنے پر مجبور کر گئی۔

آواز میں کوئی بلند آہنگی نہیں تھی لیکن اس کے اندر ایسی سردی تھی کہ ہڈیاں چٹخ جائیں۔

"دیکھیں..." پہرے دار کی آواز کپکپائی۔ جیسے حکم عدولی کرنے جا رہا ہو۔

"مجھے اجازت نہیں ہے"

مبہم انکار پر اس کی آنکھیں ایک لمحہ کو بند ہوئیں۔ جیسے تحمل کے آخری کنارے پر کھڑا ہو۔

"میں نے تم سے رائے نہیں مانگی۔ صرف حکم دیا ہے۔ دروازہ کھولو"

پہرے دار نے ایک نظر اس کے عقب میں دوڑائی۔ امید تھی کہ کوئی تو ہو گا جو اسے روک لے گا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کوئی سایہ، نہ آہٹ۔

"آپ سمجھنے کی کوشش تو کریں۔ میں ایسے آپ کو اندر نہیں جانے دے سکتا"

اب کی بار کا انکار کسی نشتر کی طرح سینے میں پیوست ہوا تھا۔

وہ دو قدم آگے بڑھا۔ اس کا قد دروازے پر کھڑے مرد سے اونچا تھا۔ مضبوط جسامت کے ساتھ وہ اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

"مجھے انکار کرنے کی سزا جانتے ہو؟"

یہ واضع دھمکی تھی۔

پہرے دار نے متذبذب ہو کر کچھ لمحے تامل کیا، پھر آہستہ سے کمر پر بندھی چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے مقابل کی مٹھی بجلی کی سی رفتار سے اٹھی اور اس کے چہرے پر ایسی شدت سے لگی کہ وہ ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔

پہرے دار کی کراہ سنائی دی لیکن اس نے ایک لمحے کو بھی رک کر اسے نہیں دیکھا۔ جھک کر چابیوں کا گچھا اٹھایا اور تیز انگلیوں سے چابیاں پلٹنے لگا۔ جیسے ہی اسے مطلوبہ چابی ملی، اس نے اسے دروازے کے سوراخ میں گھسیڑ دیا۔

ایک "کلک" کی بھاری آواز سنائی دی اور دھاتی دروازہ "چڑ" کی ناگوار صدا کے ساتھ کھل گیا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے" پہرے دار نے پھر روکنے کی کوشش کی۔

مگر وہ تب تک سیڑھی پر پہلا قدم رکھ چکا تھا۔

تہہ خانے کی سیڑھیاں نیچے کو جاتی تھیں، اندھیرے میں گم۔جہاں نمی، پتھروں اور قید کی بو موجود تھی۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی چاپ گونج رہی تھی۔

پہرے دار پیچھے کھڑا تھا، زخمی چہرے پر ہاتھ رکھے، سراسیمگی اور بے بسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں خوف نہیں، بلکہ ایک گہرا اندیشہ تھا کہ اندر جانے والا اس کا کیا حال کرے گا جو پہلے سے قید میں مرنے کے دہانے پر تھا؟

سیڑھیوں سے نیچے اندھیرے میں ایک چہرہ، ایک زخم اس کے انتظار میں تھا۔

سردی اپنے جوبن پر تھی۔ یخ بستگی نے ہوا کو چاقو کی دھار سا تیز کر دیا تھا۔اور اس بے رحم موسم میں، اس ویران تہہ خانے میں زندگی کی رمق لیے صرف ایک وجود قید تھا۔وہاں کوئی دوسرا نہیں تھا۔

صرف وہ تھا۔

ایک تنہا، خاموش سایہ۔ جس کے لیے یہ تمام اندھیرے چنے گئے تھے۔ اور ان آنکھوں کو اس کے سوا کسی اور کی تلاش بھی نہیں تھی۔

تہہ خانے کی ٹھنڈی نم دیواروں سے قطرہ قطرہ سناٹا ٹپک رہا تھا۔ اور وہ اس میں خود کو دھکیلتا جا رہا تھا۔

وہ جیسے ہی نیچے پہنچا، ایک عجیب ناگوار اور بوسیدہ سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

لمحہ بھر کو آنکھیں سکیڑیں، ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا، لیکن پھر اپنی نگاہوں کا زاویہ سیدھا کیا اور قدم بڑھا دیے۔ اس وقت اسے اس بدبو سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ کسی شکاری چیتے کی تیزی سے اس دروازے کی طرف لپکا جہاں وہ نڈھال سا فرش پر گرا پڑا تھا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک گہری سانس لی۔ جیسے خود کو سنبھالا دے رہا ہو۔ پھر گردن موڑ کر اندر جھانکا۔

محکوم وجود نے اپنے قریب کسی کی آہٹ پا کر سر اٹھایا تھا۔ آہستگی سے گردن کے پٹھوں پر زور ڈال کر دھیرے دھیرے کو خود کو سہارا دے کر سیدھا کیا۔ آنکھوں کے قریب نیل اب جامنی ہو چکے تھے۔ چہرے پر اتنی سوجن تھی کہ وہ پہچانا بھی نہیں جا رہا تھا۔

مدھم روشنی سے اس کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ نجانے کتنے دنوں بعد روشنی کی چمک دیکھی تھی۔ وہ چند لمحے غائب دماغی سے نووارد کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ فوراً اسے پہچان کر چوکنا ہوا۔ آنکھوں میں ایک احساس ابھرا تھا۔ سناشائی کا، کسی اپنے کا۔

وہ اس شخص کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ایک لمبا عرصہ ساتھ گزارا تھا۔

"بہت دنوں بعد آئے ہیں آپ.... خیریت؟"

معمول کے مطابق ہی اپنے پھٹے ہونٹوں سے خوش آمدیدی مسکراہٹ اچھال کر پوچھا۔ انداز میں بشاشیت تھی، لیکن آواز میں نہیں۔

وہ ساکت سا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی اس قدر پرسکونی اس کی رگوں میں شعلہ بھڑکا گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں زہر گھول کر کیسے اتنا مطمئن رہ سکتا تھا؟ اگر وہ برباد ہوا تھا تو سامنے والے کی زندگی اب تک راکھ کیوں نہیں ہوئی تھی؟ اس کے صبر کا شیرازہ بکھرنے کے قریب تھا۔ اور پھر وہ پھٹ پڑا۔ اپنے تمام بند توڑتے۔

"اپنی زبان سے میرے ساتھ ہم کلام ہونے کی جرات بھی مت کرنا"

آواز اس قدر بلند تھی کہ سارا تہہ خانہ گونج اٹھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا، مٹھیاں سختی سے بند تھیں، اور جیسے ہی اس کا غصہ برداشت سے باہر ہوا اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے پٹ زور سے دیوار سے جا ٹکرائے۔ وہ اندر آیا۔ بو کی شدت میں اب وہ بالکل بے پرواتھا۔ وہ تیزی سے جھکا، زخمی وجود کو گریبان سے پکڑا اور کالر سے کھینچ کر اوپر اٹھا لیا۔

یکدم کی پکڑ پر اس کی گردن پر رگڑ آئی تھی۔ جلد چھل گئی۔ لیکن وہ بغیر اثر لیے اسے مزید آگ لگانے کے درپے ہوا۔

"سوری...." آواز میں کوئی ندامت نہیں تھی۔ محض زبردستی کی شائستگی تھی۔

"میرے پاس بس ایک ہی زبان ہے۔ اور وہ میری اپنی ہے۔ اب محض آپ سے بات کرنے کے لیے میں کسی اور کی زبان ادھار نہیں لے سکتا"

وہ کوئی انتہا کا ڈھیٹ تھا۔ اپنے کالر پر بڑھتی گرفت سے اسے فرق ہی نہیں پڑا۔ نہ ہی ان زخموں کے درد سے جو اسے ہر لمحہ اذیت دیتے تھے۔

مقابل نے ہمیشہ کی طرح اس کی جواں مزاجی پر دانت جمائے۔دل کیا اس کا قصہ یہیں ختم کر دے۔یہیں اندھیروں میں اسے زندہ گاڑھ دے۔

لیکن نہیں۔وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

تجسس انسان کی کمزوری ہے۔اور اسے تجسس تھا۔جب تک اسے جواب نہیں مل جاتا وہ اسے ختم نہیں کر سکتا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟"

لہجے میں صرف سوال تھا۔اور کچھ نہیں۔نہ کوئی جذبہ،نہ کچھ اور۔ محض سوال۔اس کا چہرہ بے تاثر تھا لیکن آنکھوں میں وہ تھکن چھپی تھی جو سوالوں کے جواب نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔

"جب آپ کو یہ پتہ ہے کہ وہ سب میں نے کیا تھا تو یہ بھی پتہ کر والیں کیوں کیا تھا"

اس نے وہی جواب دیا جو وہ گزشتہ مہینے سے دے رہا تھا۔آواز کمزور تھی، لیکن لہجہ اب بھی چٹان جیسا سخت۔

مقابل کا تنفس بگڑا۔ پھر وہ جھٹکے سے جھکا۔ زخمی وجود کا سر بالوں سے پکڑا اور زبردستی اپنے سامنے کیا۔ انگلیوں کی گرفت سخت تھی اور وہ زخمی سر اس گرفت میں لرز رہا تھا۔

"مجھے جواب دو۔ تم نے کیوں کیا؟ مجھے بس جواب دے دو۔ میں تمہیں ابھی آزاد کر دوں گا"

وہ اس کے زخمی چہرے کو دیکھ کر اب ملتجی تھا۔ وہ اس ڈھیٹ انسان پر سارے داؤ آزما چکا تھا۔ لیکن وہ جواب نہیں دیتا تھا۔

وہ کوئی حاکم نہیں تھا۔ بس ایک تھک چکا انسان تھا جو سچ کی تلاش میں خود بکھر رہا تھا۔ اسے مزید یہ دکھ اپنے اندر نہیں رکھنا تھا۔ وہ کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔ ساری دنیا کے سامنے وہ خود پر نقاب چڑھا سکتا تھا، لیکن جب خود سے ملاقات کرتا تھا تو دل پھٹنے کے قریب پہنچ جاتا تھا۔ اسے اب اس غم سے آزادی چاہیے تھی۔

"دیکھو....."

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ حلق کانٹوں سے بھر گیا تھا۔

"میں تم سے زیادہ کچھ نہیں مانگ رہا۔ چلو جواب نہ سہی.... تم.... تم مجھے بس وجہ بتا دو"

وہ اب اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھامے نرمی سے بول رہا تھا۔ انگوٹھے زخمی چہرے کے کناروں پر آہستہ سے پھسل رہے تھے۔ دل کی سختی پگھلنے لگی تھی۔

جبکہ اس کے برعکس زخمی ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہلکی سی گردن اس کی طرف موڑی۔ آنکھیں اس کی متورم ،سوجی آنکھوں میں گاڑھیں۔ لب تھوڑے سے کھولے۔ اور جب بولا تو انداز برف جیسا ٹھنڈا تھا۔

"موت کا تمغہ میرے سینے پر کب سجائیں گے؟"

وہ پراسرار انداز میں مسکرایا تھا۔ جیسے اپنے انعام کے بارے میں استفسار کر رہا ہو۔ آنکھوں میں نہ خوف تھا، نہ گھبراہٹ۔ ایک عجیب سا سکون اور بے پناہ اطمینان جھلک رہا تھا۔

اور وہ جو اس کے چہرے کو نرمی سے سہلا رہا تھا یکدم ٹھہر گیا۔ ہاتھ کی حرکت جیسے مفلوج ہو گئی۔ ساری شفقت، ساری حرارت ہوا ہو گئی۔ وہ لمحہ بھر کو ساکت رہا پھر آہستگی سے پیچھے ہٹا۔ ماتھے پر بل گہرا ہوا۔

"تمہیں موت چاہیے؟" لہجہ ابھی بے یقین تھا۔ لیکن نظروں میں ایک زہر تھا جو آہستہ آہستہ اترنے لگا۔

"کم آن... یہ سوال پوچھنا تو بنتا ہی نہیں ہے" تمسخر سے سر جھٹکا۔ آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ایک دھار تھی جو موت کو دعوت دے رہی تھی۔

اس نے ایک سرد سانس لی اور دھیرے سے قدم پیچھے کیا۔

"تمہیں موت نہیں آئے گی..." وہ عجیب سے انداز میں بولا تھا۔

پھر یکدم جیسے صبر کا بند ٹوٹا۔ اس نے جھپٹ کر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے زخمی کندھے کو جکڑا جہاں گرم سلاخ کے داغے جانے کے زخم موجود تھا۔

"تمہیں موت کبھی نہیں آئے گی..." اس کا لہجہ اب سرد تھا۔

اس نے یکدم ہی اپنے انگوٹھے کی سخت پور کندھے کی جلد کے اندر گھسیڑ دی۔ وہ حصہ جو پہلے ہی پھٹا ہوا تھا۔

"میں تمہیں کبھی مرنے نہیں دوں گا"

دباؤ اتنا شدید تھا کہ مقابل کی چیخیں گونجتی ہوئیں دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ سارا تہہ خانہ اس درد سے لرز رہا تھا۔

"تم موت مانگو۔ میں تمہیں موت کے منہ سے کھینچ لاؤں گا"

وہ اب اس کے قریب جھکا ہوا تھا۔ ایک گھٹنا زمین پر، دوسرا جسم کے وزن کے ساتھ اس کے سینے پر جمایا ہوا۔ اس کا چہرہ بالکل قریب تھا۔ پسینے کی نمی دونوں کے ماتھوں سے بہہ کر زمین پر ٹپک رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر انگوٹھے سے گوشت کو گہرائی تک دبوچا۔

لاغر وجود اب زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ گردن بے جان ہو کر پیچھے ڈھلک گئی۔

"جواب دو گے؟" زخم پر اپنا دباؤ بڑھاتے وہ غرایا۔ امید تھی اب جواب آئے گا۔ لیکن...

"موت دیں گے؟" ہانپتے ہانپتے دوبدو پوچھا گیا۔ زبان خشک، ہونٹ زخمی، لیکن نگاہ میں وہی ہٹ دھرمی۔

عقب سے اچانک قدموں کی آہٹ اور تیز بھاگتی سانسوں کی آواز آئی۔

کوئی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ شب خوابی کا لباس بدن پر تھا اور چہرہ پریشان۔ یقیناً کسی نے اطلاع دی ہوگی کہ وہ تہہ خانے میں ہے۔

"وہ مرجائے گا" وہ پھولی سانس میں گھبرایا ہوا بولا۔

لیکن اس بے رحم انسان نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے ایک بازو سے وہ لاغر گردن تھامی، دوسرے سے دیوار کے ساتھ زور سے جا لگایا۔

"اسے کہو مجھے جواب دے"

گرفت اب فولاد جیسی ہو چکی تھی۔ جسم تناؤ میں تھا، شانے سخت، جبڑے بھنچے ہوئے۔

آنے والا کبھی اسے کمر سے تھام کر پیچھے کھینچتا، کبھی بازو سے پکڑ کر ہٹانے کی کوشش کرتا ۔ لیکن وہ ہر بار چیتے کی طرح دوبارہ جھپٹتا۔ جیسے شکار چھن جانے کا خطرہ ہو۔

اس نے اس کا سر تھاما ہی تھا کہ اچانک وہ زخمی وجود توازن کھو کر ایک زوردار آواز کے ساتھ نیچے جا گرا۔

سارے تہہ خانے میں سناٹا چھا گیا۔

جواب مانگنے والا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کے لب منجمد ہو گئے۔ نظروں میں کچھ ٹوٹنے جیسا تاثر تھا۔

سب سے آخر میں آنے والے نے اسے آہستہ آہستہ سہارا دے کر کھڑا کیا۔

لمبا چوڑا وجود جو کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اب اس کے ساتھ گھسیٹتا جا رہا تھا، جیسے کوئی بے جان جسم ہو۔

اس کی آنکھیں اب بھی اس زخمی پر جمی تھیں جو فرش پر اوندھے منہ پڑا کھانس رہا تھا۔

وہ مرا نہیں تھا۔ مطلب... جواب کی امید باقی تھی۔

"زندگی میں جو مرضی ہو جائے، ہوش کبھی نہیں کھونے چاہیے۔ باہر پہرے دار کھڑے ہیں۔ احتیاط ضروری ہے"

سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر اس نے ہمدردی سے اس کے بکھرے بال درست کیے، کپڑوں کی شکنیں ختم کیں، اور کچھ لمحے اسے سنبھلنے دیا۔

ہاتھوں پر تشدد کے باعث جلن ہونے لگی تھی، اس نے لمبے لمبے چند سانس لیے۔ پھر آنکھیں بند کیں، خود کو بمشکل سنبھالا اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحے کو ٹھہر کر نیچے دیکھا، پھر تیزی سے، بنا کسی پر کوئی غلط نظر ڈالے، سیڑھیاں چڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ اس کا آخری دورہ نہیں تھا۔

چند دنوں بعد وہ واپس آئے گا۔

شاید تب تک وہ شخص اسے کوئی جواب دے دے۔

اندر رہ جانے والے نے بھی ایک خاموش، بے تاثر سی نظر نیچے ڈالی۔

زمین پر لیٹا وہ زخم خوردہ وجود کھانستا ہوا مسکرا رہا تھا۔

مسکراہٹ میں خون رس رہا تھا، لیکن نگاہ میں اب سفاکی جھلک رہی تھی۔

"انہیں کہنا... مر جاؤں گا۔ لیکن جواب نہیں دوں گا"

اتنی ہی ہمت تھی، وہ اتنے ہی الفاظ ادا کر پایا۔ لیکن آواز اب بھی سنائی دی، جیسے صدا ابھی باقی ہو۔

دور کھڑے شخص نے تھکا ہوا سا سر جھٹکا اور خاموشی سے بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔

تہہ خانے میں اب اوپر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

نیچے واپس اندھیرا چھا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ فرش سے اٹھا۔ دونوں ہاتھوں سے سہارا لے کر خود کو سنبھالا، پھر سیدھا کھڑا ہو کر لمبے گہرے سانس لینے لگا۔

آنکھوں کی چمک اب بھی ویسی ہی تھی۔ لیکن جسم درد کی شدت سے پتھر بن چکا تھا۔

تکلیف ایسی تھی کہ وجود کا ریشہ ریشہ گویا ادھڑ رہا تھا۔ اور ہر ٹوٹتی نس اسے موت کا ذائقہ چکھا رہی تھی۔

اس تمام تر بے رحمی اور ستم کے باوجود.....

ایک بات تو طے تھی....

نہ وہ کچھ بتائے گا، نہ اس کے سامنے جھکے گا۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

ناروے

ایک دل آویز سرزمین جو شمالی دامنِ فطرت میں یوں چھپی ہے جیسے کسی کہکشاں کا ٹکڑا چپکے سے زمین کی آغوش میں آگرا ہو۔ جہاں نیلگوں آسمان برف کی اجلی چادر کے ساتھ ایسے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے جیسے آب، نیل و قمر ایک دوسرے میں گھل گئے ہوں۔

یہاں کے بلند و بالا کوہسار، ژرف جھیلیں اور سر سبز وادیوں سے لپٹے جنگل ایک ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں جو دل کو تسکین آنکھوں کو طمانیت اور روح کو قرار بخشتا ہے۔

ویسے تو ناروے کے ہر شہر کی اپنی ایک جداگانہ کشش ہے۔ لیکن اس کا دارالحکومت اوسلو اپنی مثال آپ ہے۔

یہاں زندگی گزاری نہیں، جی جاتی ہے۔اور خوبصورتی تو جیسے اس شہر کا دوسرا نام ہو۔اس شہر کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ **اوسلو سے گزرنا گویا ناروے کی روح سے گزرنے کے برابر ہے۔**

اگر ہم اسی اوسلو کی گلیوں میں خراماں چلتے ہوئے اس کی سیر کو نکلیں تو ہمیں ایک خاص گوشہ نظر آئے گا جسے **سنٹرم** کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس وقت یہ پورا علاقہ گزشتہ شب کے سکوت کی دبیز چادر کے برخلاف ایک مدھم سی روشنی میں نہا رہا تھا۔

نیلگوں آسمان پر کوئی کہکشاں اتر آئی تھی جو دھیرے دھیرے زمین کی چھاتی پر اپنے نور کا بوسہ ثبت کر رہی تھی۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

درختوں کی شاخیں شبنم کی طرح برف کی بوندوں سے جھلملا رہی تھیں اور دور کی عمارات کہرے کے حجاب میں کچھ دھندلی، کچھ خوابیدہ سی دکھائی دے رہیں تھی۔

ہر جانب برف نے کسی مغربی دلہن کی طرح سفید آنچل اپنے چہرے پر انڈیل رکھا تھا۔ برفباری اب نسبتاً کم ہو چکی تھی۔ مگر میونسپلٹی کے خدام، جنہوں نے نارنجی جیکٹس زیب تن کی تھیں۔ بدستور اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

اتوار کا دن تھا۔ چھٹی کا دن۔ کچھ لوگ گھروں سے نکل کر بازاروں اور گلیوں میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ کوئی جوڑا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے برفیلے رومانی منظر میں کھویا ہوا تھا تو کچھ بچے برف سے کھیلتے ہوئے اپنی معصوم ہنسی سے فضا کی سرد مہری کو محبت سے گرما رہے تھے۔

عین اسی منظر کے درمیان وہ بھی اپنے گھر سے نکل کر اس عمارت کی طرف جا رہا تھا جس کے باہر **ڈائجمین بیورو** کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

بلند قد و قامت والے مرد کی جسامت پر ایک لمبا سر مئی اونی کوٹ تھا۔ گردن کے گرد چیک دار مفلر نفاست سے لپٹا ہوا تھا اور پیروں میں سیاہ چمڑے کے بوٹس تھے جن کی چاپ برف سے ڈھکی اینٹوں کی راہ گزر کو چھوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

چہرہ تقریباً پورا مفلر کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ فقط دو بھوری آنکھیں دکھائی دیتیں تھیں جو گرد و پیش کی خوبصورتی کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

برفباری میں گاڑی چلانا آسان نہیں ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کب گاڑی زحمت بن جائے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ویسے بھی اس کا گھر سنٹرم میں ہی واقع تھا اور لائبریری زیادہ دور نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے اس پرسکون اور خوابیدہ صبح میں برف کے اوپر نرم قدموں کے ساتھ چلنا بہتر جانا تھا۔

بالآخر جب چہل قدمی کرتے وہ لائبریری کے داخلی دروازے تک پہنچا تو شیشے کا خودکار دروازہ خاموشی سے کھل گیا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

لائبریری کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اندر کی نرم و ملائم گرم ہوا نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ یہ جگہ اپنے سلیقے، سکون اور جدید سہولت کے حسین امتزاج کی وجہ سے اس کی فہرست اول میں تھی۔

اس کے قدم بغیر کسی جھجک کے ایک شناسا رستے پر چلتے ہوئے اس ڈیسک کی طرف بڑھے جہاں بڑے سائز کے رجسٹر، ایک کمپیوٹر، قرینے سے رکھا گیا پیپر ویٹ اور قلم پین ہولڈر میں رکھے ہوئے تھے۔

ڈیسک کے پیچھے ایک آرام دہ کرسی پر بز کٹ والا تھیو بیٹھا تھا۔ چہرے کے آگے ایک کتاب کیے، دنیا و مافیہا سے بے خبر کافی کے گھونٹ بھرتا ہوا۔

آنے والا کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تھیو حسب معمول کسی سنسنی خیز کہانی کی گرہیں سلجھانے میں محو تھا۔

اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر اس کتاب کے سرورق پر جا ٹھہری جس پر ایک سیاہ پنجے کا ہیبت ناک نشان چھپا تھا اور بیچوں بیچ چمکتے حروف میں **دی وسپر مین** لکھا تھا۔

"ہالو" (ہیلو)

گلا کھنکھار کر دو انگلیوں سے ڈیسک کھٹکھٹایا گیا۔ پتہ تھا جب تک کوئی آواز پیدا نہیں ہو گی تھیو کتاب کے سمندر میں غرق ہی رہے گا۔

اور اس کے اندازے کے عین مطابق الفاظ کی رو میں بہتا تھیو چونک کر سیدھا ہوا تھا۔ اس نے کتاب بغیر بند کیے یونہی الٹا کر رکھی۔ چہرہ اٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔

"سالوے؟" چہرے پر حیرت در آئی۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس موسم میں آج آؤ گے" اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا جہاں برف ابھی بھی مدھم رفتار سے گر رہی تھی۔ اسے اتنی برفباری میں اس کے کیا، کسی کے آنے کی قطعی امید نہیں تھی۔

ناول کلب
Clubb of Quality Content

سالوے نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی ذرد رنگت پر ابھرتے حیرانگی کے تاثرات کو دیکھا۔ ابرو اوپر کو اٹھے۔ جتنا حیران وہ ہوا تھا، اس پر ایسا ردِ عمل بنتا تھا۔ اگر اسے امید تھی کہ آج کوئی نہیں آئے گا تو پھر لائبریری کیوں کھول کر بیٹھا تھا؟ بذاتِ خود کتاب خوری کرنے کے لیے؟

"تو تم کیا چاہتے تھے؟ میں آج کتابیں واپس نہ کروں اور تم مجھے جرمانہ کر دو؟"

وہ ہیٹر کی ملائم گرمی کو محسوس کرتے ہوئے دو انگلیوں سے مفلر کو چہرے سے سرکا کر گویا ہوا۔

اب اس کا چہرہ مکمل طور پر نمایاں تھا۔ کلین شیو، نکھری ہوئی رنگت، بے داغ جلد۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی ذات کی ہر پرت کو سنوار کر رکھتا ہو۔

بظاہر دکھنے میں وہ نارویجین لگتا تھا، لیکن اس کی صورت میں ایک اور تہذیب کی مہک تھی.....کوئی اجنبی سی پہچان۔ جو اسے یہاں کے باشندوں سے ذرا مختلف بناتی تھی۔

تھیو نے اس کی بات پر ایک گہری سانس لی۔اپنی چوری پکڑے جانے پر وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"زیادہ مائنڈ ریڈر بننے کی ضرورت نہیں ہے.... آخر تم جیسے انڈور انتھوزیسٹ (indoor enthusiast) سے میں کیا امید رکھتا کہ سالوے مارکس جیسا بندہ اپنا کمفرٹ چھوڑے گا؟ برف میں نکل کر اپنی جان پر ظلم کرے گا؟ نو وے..."

اس نے منہ کے زاویے بگاڑتے، ہاتھ ہلاتے ہلاتے کچھ بھرم سے کہا۔ہاں سالوے کی کہی بات درست تھی۔ لیکن پھر بھی، اسے اتنا بلنٹ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"جیسے میں تو تمہاری اسکیم جانتا ہی نہیں ہوں" وہ اس کی اداکاری سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

تھیو نے مایوسی سے کندھے جھکا کر ملامتی انداز میں سر جھٹکا۔ لیکن ذہن میں بے ساختہ ایک ہی سوچ گردش کر رہی تھی... اسے اس اسکیم کا پتہ چلا تو چلا کیسے؟ یہ تو اس کا ٹاپ سیکریٹ تھا۔

کھسیانہ ہوتے وہ بلاوجہ ہی ڈیسک کے دراز کھولنے لگا۔

"تمہارا دماغ بہت منفی سوچتا ہے، سالوے۔ اتنی نیگیٹویٹی صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی... تمہیں چاہیے کسی پازیٹیو ایکٹیوٹی میں خود کو مصروف رکھا کرو"

کتنا ہی افسوس تھا لہجے میں۔ نفی میں گردن دائیں بائیں ہلاتے اس نے کونے والا دراز کھولا اور اس میں سے ایک ہاٹ پیک نکال کر بے ساختہ سالوے کی طرف بڑھا دیا۔

سفید پیکٹ نما چیز کو دیکھتے سالوے کے ابرو ایک بار پھر اوپر کو اٹھے تھے۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب بھی کوئی بات بے وقت، بے محل یا خلافِ توقع پیش آتی تھی تو وہ یونہی خاموشی سے ابرو اچکا کر اپنی حیرت یا ناگواری کا اظہار کیا کرتا تھا۔

"تمہارے نزدیک جو پازیٹیوٹی ہے نا۔ وہ مجھ میں تبھی آئے گی جب میں اپنے پیسے تم پر خرچ کروں گا۔ اور ایسی پازیٹیوٹی سے اچھا ہے میں نیگیٹو ہی رہ لوں"

بغیر کسی جھجک کے ہاٹ پیک تھامتے اس نے بھی دوبدو حساب برابر کیا۔ جواباً تھیو نے کچھ کہنے کی بجائے خفت سے لب بھینچ لیے۔

سامنے کھڑے شخص نے لحاظ کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

تھیو کے پھولے چہرے کو دیکھنے سے گریز کرتے، اس نے اپنے بازوؤں میں موجود کتابیں نہایت اہتمام سے میز پر رکھیں... بالکل اس کے روبرو۔ وہ آج انہیں واپس کرنے ہی یہاں آیا تھا۔

میز پر رکھی موٹی، خاک آلود، جلدوں سے محروم یا پھر چمڑے میں لپٹی ہوئی، ان کتابوں کے اوراق سے صدیوں کی گرد جھڑتی تھی۔

یہ وہ کتابیں تھیں جنہیں سالوے کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہاتھ لگاتا ہو۔ ڈائچمین بیورو کی الماریاں جدید ادب کی رنگارنگی سے بھری ہوتی تھیں۔ رومانی تحریریں، سنسنی خیز، کہانیاں،

خوف و ہیبت سے لبریز ناول۔اک نئی نسل کی روح کو بھا جانے والا سارا سامان وہاں میسر تھا۔

لیکن سالوے ایک فراموش کردہ صدی کا آخری مسافر تھا جس کی روح نہ تاریخ سے پیچھے ہٹی تھی،نہ زمانے کی چکاچوند سے مرعوب ہوئی تھی۔

وہ ایسا راہ گیر تھا جو وقت کی دھول چاٹ کر بھی اپنی متانت پر قائم رہا تھا۔

وہ پرانی اور بوسیدہ کتابیں پڑھتا تھا۔تھیو اکثر اسے نئی کتابوں کے بارے میں بتاتا۔اس کی توجہ نئے انداز تحریر کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا۔لیکن سالوے ہمیشہ معذرت کرکے کوئی پرانی کتاب اٹھالیتا۔

"مجھے ان صفحات کی خوشبو اچھی لگتی ہے، تھیو۔ویسے بھی اگر علم مخلص ہو تو پرانی کتابوں میں کہیں زیادہ گہرائی رکھتا ہے"

وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔

شروع میں تھیو نے بحث کی، اصرار بھی کیا۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ سالوے ان معدودے چند لوگوں میں سے تھا جو وقت کی تیز دھار سے نہیں اپنی مرضی کے مطابق چلتے ہیں۔

"آج کی تاریخ نوٹ کر لو... آخر کار یہ بھی ڈائجمین بیورو کا میں واپس اپنے گھر لوٹ آئی ہیں"

سالوے نے اس کا دھیان کتابوں کی طرف کرواتے انہیں اس کی طرف سر کا دیا۔

تھیو نے ہنوز منہ بنائے خاموشی سے انہیں ہاتھ میں لیا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگایا۔ پھر کتابوں کی جانچ کرنے لگا۔ ساتھ میں ایک بڑا سا رجسٹر بھی کھول لیا تھا جس میں سے وہ چشمے کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں کو حرکت دیتے اس کا ریکارڈ کھنگالنے لگا۔

وہ تھیو کو کام میں مصروف دیکھ، ڈیسک سے ہٹتے شیلونگ ایریا کی طرف آ گیا۔ اب کتابیں واپس کر دی تھیں تو اسے نئی کتابیں تلاشنی تھیں۔

اونچے اونچے ریکس ایک پر اسرار جنگل کی طرح قطار در قطار کھڑے تھے۔ ہر ریک کے اوپر اس کی یونزا کو بلائی تختی پر خوبصورت جلی حروف میں لکھا گیا تھا۔

ان ساری ریکس کو دیکھتے ہوئے وہ سب سے آخری ریک کے سامنے جا رکا۔ وہ اپنی کتابیں اسی ریک سے لیتا تھا۔ باقی ریکس تو اس کے لیے بس دیکھنے کی حد تک ہی رہتیں تھی۔

اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کتابوں کو چھو کر محسوس کیا۔ بلکہ یہ کہنا ذیادہ مناسب ہو گا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کتابوں کو نہیں چھو رہا تھا۔ بلکہ کتابیں اسے چھو رہیں تھی۔

یونہی اپنی انگلیوں کو کتابوں پر پھیرتے وہ ٹھہر گیا۔ تلاش ختم ہوئی تھی اور پھر اس نے ایک کتاب باہر نکال لی۔

"Revelation Of Divine Love"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

جولیان آف نارو یچ کی لکھی گئی پندرویں صدی کی ابتدا کی یہ کتاب سنہری حروف کی صورت سرورق کی چمک کو مزید اجاگر کر رہی تھی۔

پچھلی بار وہ اسے لینے کی خواہش کے باوجود گھر نہیں لے جا سکا تھا، کیونکہ تب وہ پہلے ہی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ اٹھا چکا تھا۔ لیکن آج... آج اس ایک ہی کتاب کی تشنگی اسے کھینچتی چلی جا رہی تھی۔

اسے فلحال یہ ایک کتاب ہی بہت تھی جسے لے کر وہ واپس تھیو کے پاس جا پہنچا۔ اس کی تیکھی سرخ ناک کے ساتھ اب گال بھی سرشاری سے سرخ ہو کر تمتمارہے تھے۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

وہ آہستہ آہستہ اپنی کتاب کی واپسی کی تفصیل رجسٹر میں لکھ رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا اور برف کے نرم ذرات جواب تک اس کے بالوں پر ٹھہرے تھے اندر کی گرمی سے پگھل کر خاموشی سے جذب ہو گئے۔

قلم کی نوک سے پہلے اس نے تاریخ لکھی، پھر کتاب کا نام اور آخر میں اپنے دستخط... ایک مہذب، خوشخط اور مکمل دھیان سے بھرپور تحریر۔

عین اسی لمحے لائبریری کا داخلی دروازہ خاموشی سے کھلا۔ ایک طرف نصب ونڈ چارم نے ہلکی سی نغمگی پیدا کی۔ خاموشی کی نیند میں سوئی ہوئی فضا نے پلکیں کھول کر کسی نامعلوم احساس کو چھوا۔ اور پھر وہ نغمہ بھی لمحہ بھر بعد خاموشی کی گود میں لوٹ گیا۔

سالوے نے آواز پر سرسری سا سر اٹھایا تھا۔

بس ایک نظر... دروازے سے آتی ایک شبیہ تھی جو تیز قدموں سے ڈیسک کی طرف بڑھ رہی تھی۔

برف سے بھیگی زمین نے اس کی بوٹس کی چاپ کو مدھم کر رکھا تھا، لیکن ہر قدم کے ساتھ وہ آواز ذرا ذرا واضح ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے ایک مختصر سی نظر ڈالی۔ پھر نووارد کے چہرے کو مکمل دیکھے بغیر دوبارہ رجسٹر پر جھک گیا۔ وہ کسی غیر ضروری خلل سے اپنی توجہ منتشر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

" تھیو! گوسپل آف تھامس واپس آ گئی؟" یہ سوال اس سے نہیں تھیو سے کیا جا رہا تھا۔ اس لیے وہ حسب معمول خاموش رہا۔

لیکن آواز میں کچھ تھا۔ ایک اضطراب، ایک بے قراری ۔ جیسے وہ کتاب نہیں کوئی خواب تلاش کر رہی ہو۔

" کلارا تم؟" کتابیں کھنگالتا تھیو ایک بار پھر چونک گیا۔ آس پاس کی دنیا یکدم ہی روشن ہوئی تھی۔

سامنے کھڑی لڑکی آسمانی رنگ کا گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے تھی جو ٹخنوں تک آ رہا تھا۔ کھلے بھورے بال کنپٹیوں سے لے کر عقبی جانب بندھے ہوئے تھے اور کندھے پر سفید پرس جس پر "C" ایک خاص نفاست سے لکھا گیا تھا۔

Clubb of Quality Content

اس کی آنکھیں... نیلی نہیں نیلگوں تھیں۔ ایسی آنکھیں جن میں تلاش کی روشنی تھی۔

نہ ہی اس کے وجود میں کوئی بلند آواز کشش تھی اور نہ ہی کوئی مصنوعی چمک۔ اس میں ایک خاموش، نرم، مہربان سی روشنی تھی۔

"گوسپل آف تھامس، تھیو"

وہ اس کی حیرت کو نظر انداز کیے اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی۔

"وہ ریک میں ہوگی" تھیو فوراً اپنی کرسی سے سرمست سا ہوتے اٹھ کھڑا ہوا۔ کلارا کے لیے وہ ہمیشہ اپنی سروسز دینے کے لیے بذات خود دستیاب رہتا تھا۔

اب وہ اسے لیے ریکس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کلارا بھی بے ساختہ اس کے ہمراہ ہوئی تھی۔

ڈیسک پیچھے رہ گیا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ شیلونگ ایریا میں جاتے سالوے نے کسی ولن کی طرح تھیو کی خوشگوار زندگی میں اینٹری مار کر بے ساختہ اسے پکارا۔

"تھیو!"

وہ رکا۔ گردن ترچھی کر کے ڈیسک پر جھکے سالوے کو دیکھا جو اسی کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"گوسپل آف تھامس... یہ پڑی ہے" قلم پر ڈھکن لگا کر اپنی واپس لائی گئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کتاب پچھلی بار وہی لے کر گیا تھا۔

تھیو نے دانت کچکچاتے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے ساتھ کھڑی لڑکی عجلت میں بولی۔

"تھینک گاڈ!" آواز میں ایک بے صبری گھلی ہوئی تھی۔ وہ تیز قدموں سے پلٹی۔

"میں ابھی جلدی میں ہوں، تھیو۔ سائن اور باقی کی رسمیں بعد میں آ کر پوری کر لوں گی" اس نے ایک ناقدانہ سی، سرسری، اجنبی اور لاپرواہ سی نظر سالوے پر ڈالی اور ڈیسک پر رکھی، اسی کے ہاتھ کے قریب پڑی، کتاب اٹھالی۔

"کلارا، میری بات..." تھیو بے چینی سے آواز دیتا رہ گیا۔ لیکن وہ ہوا کی پگڈنڈی پر سوار کسی خاکستری تتلی کی طرح پلک جھپکتے میں دروازے سے باہر چلی گئی۔

لمحوں میں یہ کیا ہوا؟ وہ سمجھ نہ سکا۔

سالوے منہ کھولے اس کاروائی کو دیکھتا رہ گیا۔

تھیو اس کا خیال رکھتا تھا اور اس کے ساتھ دوستانہ رویہ اپناتا تھا۔ لیکن کبھی اسے اس قدر ڈھیل نہیں دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کم از کم ریکارڈ کے طور پر دستخط تو ضرور کرواتا تھا۔

اس سارے سانحے کا نچوڑ بے حد واضع اور مختصر تھا۔ وہ یہ کہ کلارا کے لیے قانون اور تھے اور سالوے کے لیے اور۔ اسے اس دو قومی نظریے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے افسوس ہوا۔

جبکہ سٹڈی ایریا کے قریب کھڑے تھیو کو تو مانو پتنگے لگ گئے۔ وہ بل کھا کر سالوے کو گھورنے لگا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتے تھے تھوڑی دیر؟ لائبریرین میں ہوں یا تم؟" کلسے ہوئے انداز کے ساتھ کہہ کر اس نے ڈیسک کی کنارے کی ایک کرسی کو کھینچا۔ پھر وہ بھنایا ہوا اس پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

اتنے دنوں بعد تو کلارا نے لائبریری میں قدم رکھا تھا۔ زیادہ نہ سہی، وہ اس سے دو چار باتیں ہی کر لیتا۔ لیکن سالوے نے یہ ممکن ہی کہاں ہونے دیا تھا۔

وہ جھنجھلا رہا تھا اور سالوے خاموشی سے کتاب کو پلاسٹک بیگ میں سمیٹ رہا تھا۔

"میں نے کیا کیا؟" بے نیازی اتنی گہری تھی کہ اسے دنیا کی الجھنوں سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

تھیو نے ضبط سے دانت پیسے۔

"تم بدھو ہو، بوڑھی روح۔ پڑھو اس پرانی کتاب کو اور اس میں ڈوب کر اپنے زمانے میں چلے جانا۔ کیونکہ کم از کم تم اس دور کے جذبات نہیں سمجھ سکتے!" اس نے پٹخ کر سالوے کی لائی گئی ایک کتاب میز پر رکھی۔

سالوے کسی کو کریدتا نہیں تھا۔ اس لیے معمول کے مطابق کندھے اچکا کر "اوکے" کہتے وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی لوٹ گیا۔

دروازہ خود بخود کھلا، برف کی سرد ہوا اندر لہرائی اور وہ باہر نکل گیا۔ لائبریری ایک بار پھر سے ویران ہو گئی۔ ونڈ چارم کی ایک خفیف سی گھن گھن دوبارہ سنائی دی۔ اور پھر ایک لمبے وقت کے لیے خاموشی چھا گئی۔

اس سناٹے میں موجود واحد نفس، تھیو سالوے کی لائی گئی کتابیں شیلف میں واپس رکھتے ہوئے مدھم آواز میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

Clubb of Quality Content

قریب ہی میز پر رکھی اس کی سنسنی خیز کتاب اوندھے منہ پڑی تھی جیسے کہانی کا قاتل ابھی بھی اس کے صفحات کے اندر چھپا بیٹھا ہو۔ جبکہ پاس رکھا کافی کا گرم کپ اب اپنی حدت سرد موسم کے سپرد کر کے خاموشی سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

اگلے دن سردی کی شدت نے کچھ دیر کے لیے اپنا زور کم کیا تھا۔ اوسلو کے رخ پر دھری برف کی چادر نے اپنا گھونگھٹ انڈیل دیا تھا۔ سورج کی نرم کرنیں آسمان کی نیلاہٹ کو چیرتی ہوئیں نیچے آ رہی تھیں اور ہر چیز کو ایک ہلکی گرمائش بخش رہی تھیں۔

اسی سورج نے اپنی کرنیں اس پر بھی ڈالیں جو کار کے اندر بیٹھا تھا ۔ سپیکر سے ایک پرانا، ریٹرو گانا آہستہ آواز کے ساتھ گونج رہا تھا۔ فرینک سیناترا کی مدھ بھری آواز نے تنہائی کو ایک دلنشینی عطا کر دی تھی۔

چچماتی گاڑی کے اندر بیٹھے ہی اس نے ایک نظر بیک ویو مرر پر ڈالی ۔ پھر آہستہ آہستہ سٹیئرنگ کو دائیں جانب گھمایا اور گھر کے گیراج کے اندر آ کر گاڑی کو روک دیا۔

سفید ہائی نیک کے ساتھ گہرے رنگ کی ڈریس پینٹ پہنے اس نے پیسنجر سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنا بریف کیس اٹھایا اور لمبے سیاہ کوٹ کو بازو کے خم کی جگہ پر رکھا۔ پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

ڈھلوانی چھت والے گھر کے سامنے ایک چھوٹا دروازہ تھا جو لان کی باڑ کو جدا کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیا اور دروازے کی کنڈی کو آہستہ سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

اندر آتے ہی گھر کی خاموشی نے استقبال کیا۔ کوئی آواز نہیں تھی، کوئی آہٹ نہیں آ رہی تھی ۔ حالانکہ اسے امید تھی کہ آج وہ لان کی تازہ ہوا میں کچھ وقت دھوپ سینکنے میں گزاریں گے۔ لیکن آج بھی چیزیں ہمیشہ کی طرح توقع کے برعکس تھیں۔

لان کے درمیان سے ہوتی روش کو آہستہ آہستہ پھلانگتے وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو سامنے دروازے کے بالکل ساتھ جوتوں کا ایک جوڑا ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ گویا کوئی پہلے ہی آچکا ہو۔

اس نے ایک نظر جوتوں کی سمت ڈالی۔ کچھ اندازہ لگاتے ہوئے آہستہ سے اپنے جوتے اتارے اور انہیں برابر کی شیلف کی نچلی خانہ دار جگہ میں جمادیا۔ ساتھ ہی چابی کو بھی ایک چھوٹی ہک پر آویزاں کردیا۔

گھر کی خاموشیوں کو چھوتے ہوئے اس نے آگے قدم رکھا۔ پہلے تو وہ ڈرائنگ روم کی سمت گیا۔ اپنا کوٹ اور بریف کیس صوفے کے ایک طرف رکھا۔ لیکن وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔

پھر وہ کچن کی طرف گیا۔ لیکن کوئی نہ ملا۔

اوپر کی منزل کے دو کمرے اور گیسٹ روم بھی خالی تھے۔

دوبارہ نیچے آتے ہوئے وہ کچن کی طرف پلٹا تو اسے احساس ہوا کہ عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نرم ہوا نے پردے کو آہستہ آہستہ ہلا رکھا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں ہوں گے۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ مسٹر مارکس آرام سے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔

وہ دروازے سے باہر نکلا اور گھر کی پچھلی سمت آ گیا۔

یہ حصہ لان کی باقاعدہ ترتیب سے قدرے ہٹ کر تھا۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی گھاس تازہ سبز رنگ کی چادر کی طرح بچھی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا کچن گارڈن بھی تھا... جہاں مختلف قسم کے پھل اور سبزیاں اگی تھیں۔ تازہ ٹماٹر، ہری مرچیں، سٹرابیری، مالٹے، لیچی ،اور دیگر۔

قریب ہی تالاب کی سطح کے نیچے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ چمکتے نارنجی اور چاندی رنگ کی۔ جو آبی پودوں کے درمیان آجا رہی تھیں۔

تالاب کے اوپر بانس کی چھڑیوں سے ایک چینی انداز کی چھوٹی سی آبپاشی بنی ہوئی تھی۔ وہ محض دیکھنے کی حد تک نصب کی گئی تھی۔ یا زیادہ سے زیادہ تالاب کے گرد لگے ننھے ننھے پودے اس نظام سے سیراب ہو کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

اسی منظر کے درمیان، سادی سی شرٹ اور پاجامہ پہنے مسٹر مارکس ایک کونے میں چوکی پر بیٹھے تھے۔ ان کی کمر کے گرد ایپرن بندھا تھا۔ جھکا سر آدھا سرمئی بالوں سے پر تھا۔ ہاتھ چکنی مٹی کو سنوارتے سنوارتے مکمل گیلی مٹی کی پرت سے اٹ چکے تھے۔

"پاپا" اس نے پکارا۔

مسٹر مارکس نے سر نہیں اٹھایا۔ لیکن ہلکی سی جنبش سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

" کتنی بار کہوں کہ مجھے ڈیڈ کہا کرو۔ اس طرح پکارتے ہوئے تم کوئی چھوٹے بچے لگتے ہو"

انہوں نے ہمیشہ کی طرح اسے ٹوک دیا۔

لیکن سالوے نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ یہ جملہ پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ اب اس میں کوئی ایسی انفرادیت باقی نہیں رہی تھی جس پر وہ کوئی رد عمل دینا ضروری سمجھتا۔

"میں نے آپ کو کہا تھا کہ آپ آرام کیا کریں۔ مارکیٹس کے چکر لگا کر آپ کو تھکاوٹ نہیں ہوتی؟"

چکنی مٹی اب گول پیالے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ابھی وہ مزید اسے نکھارتے جب اس نے ان کا مٹی سے لتھڑا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ سفید ہائی نیک پر مٹی لگ سکتی تھی۔ داغ نمایاں ہو سکتے تھے۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔

"اٹھیں یہاں سے۔ آپ کو منع بھی کیا تھا چھوڑ دیں یہ کام "وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا جو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلے تھے۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"اسے پورا تو کرنے دو" اشارہ سامنے چاک پر جمے پیالے کی طرف کیا۔ لیکن سالوے کا چہرہ یکدم ہی سنجیدہ ہوا تھا۔

اسے یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کا باپ اتنا ضدی کیوں تھا؟

"آپ کو مجھے اذیت دے کر اچھا لگتا ہے؟ اس عمر میں آپ کو یوں گھنٹوں بیٹھے دیکھ کر مجھے جو تکلیف ہوتی ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتے، پاپا۔ کم از کم میرا کچھ خیال کر کے ہی چھوڑ دیں یہ.... پلیز بس کریں" اس کا ہاتھ ان کے بازو پر دباؤ بڑھانے لگا۔

مسٹر مارکس نے اس کی فکر پر ایک نرم سی مسکراہٹ اچھالی لیکن اٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

" کہہ تو رہا ہوں مجھے یہ پورا کرنے دو۔ پھر اٹھ جاؤں گا۔ تب تک تم فریش ہو کر آؤ۔ میں نے خود آج کھانا بنایا ہے وہ بھی...."

"سالمن" اس نے بیزاری سے ان کی بات کاٹی۔ انہیں ایک یہی چیز بنانی آتی تھی۔ ناروے کی مشہور مچھلی سالمن۔ آرام سے مچھلی کو گرل کر کے وہ ہمیشہ اسے یہی کھلا دیتے تھے۔ اس کا آدھا بچپن یہی ڈش کھاتے تو گزرا تھا۔

مسٹر مارکس اس کے صحیح بوجھنے پر محظوظ ہوئے۔

"یقیناً تمہیں خوشبو آ گئی ہو گی۔ اب جاؤ جلدی سے" انہوں نے اپنے ہاتھ چھڑوائے اور چاک کے ایک طرف پڑا نوک دار قلم تھام لیا۔ یہ قلم وہ نقش و نگاری کے لیے استعمال کرتے تھے۔

وہ قلم پیالے پر رکھ کر ایک ایک نقش کو بہت آہستہ، بہت دلجمعی کے ساتھ کھودنے لگے۔ کبھی قلم کو آگے کھینچتے پھر آہستہ آہستہ اسے پیچھے کی طرف موڑتے۔ یوں کہ ہر خط کی گولائی ہمواری کی ایک تازہ تاریخ رقم کرتی جائے۔ ان کا ایک پیر مسلسل چاک گھمانے میں مصروف تھا۔ کبھی وہ قریبی تالاب میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ڈبو کر گیلا کرتے تو کبھی پیالے کو اپنی انگلیوں سے چھو کر ہموار کرتے۔

سالوے کب سے کھڑا ان کی ایک ایک حرکت ملاحظہ کر رہا تھا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا اس نے اپنے باپ کو اپنی جاب اور برتن بنانے کے علاوہ کبھی کوئی تیسرا کام کرتے دیکھا ہو۔

"پاپا" اس نے پھر پکارا۔

مسٹر مارکس نے "ہوں" کرتے ہنکارا بھرا اور پہیہ مزید تیزی سے گھمانے لگے۔

"آپ یہ کام چھوڑ دیں" کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ مزید یہ سب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

مسٹر مارکس رکے۔اسے دیکھا۔ پھر پہلے کی طرح ہی مسکرادیے۔وہ اکثر یہ بات کیا کرتا تھا۔اس میں کچھ خاص نہیں تھا۔وہ نظر انداز کر کے واپس برتن سنوارنے لگے۔

"خود کو تھکانے اور مجھے اپنی صحت کے حوالے سے فکر مند کرنے کے علاوہ اس برتن سازی (Pottery)سے آپ کو اور مجھے کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا"

اس کا سنجیدہ چہرہ سپاٹ ہو گیا۔مسٹر مارکس کے ہاتھوں کی روانی مدھم پڑی۔یکدم ہی آس پاس کی رنگین دنیا کے رنگ پھیکے پڑتے نظر آئے۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" آواز میں دھچکا تھا۔یقین ہی نہ آیا کہ تہذیب و علم میں بسنے والا سالوے اپنے باپ کے ساتھ اس طرح،اتنی سطحی سوچ کے ساتھ مخاطب ہو رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں"وہ رکا۔الفاظ کا ذخیرہ تلاش کیا۔پھر گویا ہوا۔

"لیکن پھر بھی اگر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے تو میں واضح کر دیتا ہوں کہ دن رات کی محنت اور لگن سے آپ کی جو کمائی ہوتی ہے وہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے..."وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ ان کے قریب آیا۔

"میں آپ کا غرور نہیں توڑنا چاہتا۔ لیکن جتنی ارننگ آپ اتنی محنت سے کرتے ہیں اتنے تو میرے فیول ایکسپینسز(Fuel expenses) پر لگ جاتے ہیں"

اب کی بار کہے جانے والے الفاظ ایک پل کے لیے مسٹر مارکس کی سانسیں تک روک گئے۔

مدھم چلتے ہاتھ مکمل تھم گئے۔چاک پر دھرا پاؤں وہیں ٹھہر گیا۔

انہیں اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔

سالوے اتنا بڑا کب ہو گیا کہ ایسی بات کہہ دے؟

جسے اپنے ہاتھوں سے سینچا اور محنت سے پروان چڑھایا،جسے اس قابل بنایا کہ وہ خود کما سکے۔وہ آج انہیں پیسوں کا طعنہ دے رہا تھا۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے جو اب آنکھیں چرا رہا تھا۔

"میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ لیکن یہ کام آپ کو تھکا دیتا ہے۔اور میں آپ کو تھکا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔میں خود گھنٹوں کام کرتا ہوں، کماتا ہوں،ایکسٹرا شفٹس تک لگا لیتا ہوں.... صرف اس لیے کہ زندگی آسان ہو سکے۔آپ کے لیے، میرے لیے،ہمارے گھر

کے لیے.... لیکن آپ کی یہ ضد میری ساری محنت، میری ساری کوششیں برباد کر دیتی ہے"

وہ ان کے جھری زدہ چہرے کو زرد پڑتے دیکھ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ سفید ہائی نیک پر مٹی کا داغ نجانے کہاں سے لگ چکا تھا۔ حتٰی کہ وہ اسی مٹی سے اپنے باپ کو دور رکھنا چاہتا تھا۔

"پاپا"

ان کی مسلسل خاموشی اب بے چین کرنے لگی تھی۔ سپاٹ چہرہ فکرمندی سے بے قراری میں ڈوبنے لگا۔

مسٹر مارکس نے لرزتے ہاتھوں سے ایک طرف پڑا دھاگہ اٹھایا۔ وہ سالوے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔

ان کی اس بے پرواہی پر سالوے کا دل ایک لمحے کو اندھیروں میں ڈوب گیا۔ وہ دنیا جہاں کے طوفانوں سے ٹکرا سکتا تھا۔ لیکن مسٹر مارکس کی ناراضگی؟ یہ خیال ہی سوہانِ روح تھا۔ جو

Clubb of Quality Content

وہ کہہ چکا تھا اب وہاں سے واپسی نہیں تھی۔ یہی تو الفاظ کا رعب ہوتا ہے۔ وہ ایک بار جہاں بس جائیں وہاں سے اپنا آپ کبھی ختم نہیں کرتے۔

وہ زندگی میں پہلی بار اپنے باپ سے یوں مخاطب ہوا تھا۔ اور اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے یہ نہایت غلط فیصلہ کیا تھا۔

"بی کلا گر" (میں معذرت خواہ ہوں)

ان کی مسلسل خاموشی پر وہ شدید شرمندہ ہوتے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسٹر مارکس ہنوز ساکت تھے۔

ان کا چہرہ اب زردی سے سفیدی مائل ہو چکا تھا۔

وہ بغیر رکے کچن کے عقبی دروازے سے ہوتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پیچھے وہ وہاں تنہا رہ گئے۔

انہوں نے آنکھوں کو جھپکا۔ اور پھر مسلسل جھپکتے رہے۔ آنکھوں کے خشک ہوتے ہی انہوں میں لرزتے ہاتھوں سے دھاگہ چاک اور پیالے کے درمیان سے گزار کر اسے علیحدہ کر دیا۔

گول اور ہموار پیالہ خوبصورت نقاشی سے تیار ان کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس پر مزید محنت درکار تھی۔ اسے رنگوں سے سجایا جانا تھا اور پھر آگ کی بھٹی کی تپش سے گزار کر پکا دینا تھا تاکہ رنگ ہمیشہ کے لیے مٹی کی سطح کے ساتھ ایک ہو جائے۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

برطانیہ

ایک جزیرہ نما بادشاہت جو انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ پر مشتمل ہے۔ یہ ایسی سرزمین ہے جہاں وقت صرف آگے نہیں بڑھتا بلکہ پیچھے کی گونج بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ یہاں کی فضا میں تاریخ، تہذیب اور مذہب کی خوشبویں رچی بسی ہے کہ پرانے گرجا گھروں کی گھنٹیاں، سنگی گلیوں کی خاموشی، اور شاہی عمارتوں کے سائے ہر لمحہ ایک داستان سناتے ہیں۔

ابھی صبح کی روشنی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ مگر عظیم برطانیہ کے شہر لندن کے شمالی کنارے پر واقع **بلیک ویسٹ** کی پہاڑیوں پر دھند کی چادر آہستہ آہستہ سرکنے لگی تھی۔

یہ لندن کے مضافات کا ایک قدیم اور خاموش قصبہ تھا۔ اس قصبے کی سب سے اونچی زمین پر ایک پرشکوہ پیلس ایستادہ تھا جسے پورے قصبے میں **"ایورہارٹ پیلس"** کے نام سے جانا جاتا

تھا۔ اس کی دیواروں پر گوتھک محرابیں سنگ مرمر کے ستونوں پر نفیس تراش خراش اور ہر سمت پھیلے باغات موجود تھے۔

پیلس کے اندر مرکزی ہال تھا جسے **"گریٹ چیپل"** کہا جاتا تھا۔جہاں ہر دیوار پر نسل در نسل گزرتے کارڈنلز اور بشپوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ زربفت لبادوں میں ملبوس آنکھوں میں سختی اور ہاتھوں میں صلیب لیے وہ تصویریں اب بھی پیلس کے باسیوں پر ویسا ہی اثر رکھتی تھیں جیسے صدیوں پہلے رکھتی تھیں۔

اوپر جاتی سیڑھیوں پر قدم دھرتے اگر ہم اس پیلس کے سفر پر جائیں تو بالائی منزل کی اس سنگ مرمر سے مزین راہداری کے آخری کونے والے کمرے میں کھلنے والی کھڑکی سے دھوپ کی پہلی کرن اندر داخل ہوتی دکھائی دیتی۔

وہ کمرہ نہایت قرینے سے سجا ہوا تھا۔ایک طرف لکڑی کی شیلف پر بائبل کی قدیم جلدیں، دوسری طرف ایک سفید پیانو،اور درمیان میں لمبے آئینے کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھا ایک نوجوان تھا۔اس کے سنہری بال ادھ کھلی کھڑکی سے آتی ہوا میں جھول رہے تھے۔

جھکی گردن اور آنکھوں کو ایک نقطے پر جمائے بیٹھا۔ وہ نکولس ایورہارٹ ہی لگ رہا تھا....

ایورہارٹ پیلس کا اکلوتا وارث۔

اس کے والد، جاناتھن ایورہارٹ وہ شخص تھے جنہیں ویسٹ کا چرواہا کہا جاتا تھا۔ ان کے خطبات نہ صرف چرچ میں بلکہ دلوں میں بھی اتر جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ عیسائیت کے اعلیٰ عہدے کے فرائض انجام دینے میں گزارا تھا۔ موجودہ وقت میں وہ خود اپنی مرضی سے، اپنے عہدے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ مگر دنیائے مسیح میں آج بھی احتراماً انہیں فادر جاناتھن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ان کے اجداد میں پادری، مبلغ، محقق اور شہید سب شامل تھے۔ ان کے پیلس میں رکھی گئی آٹھ سو سال پرانی بائبل سونے کے کناروں اور ہاتھ سے لکھی آیات کے ساتھ خاندان کی وراثت سے زیادہ کلیسا کی امانت تھی۔

نکولس انہی سب میں پلا بڑھا تھا۔ ایک ایسی فضا میں جہاں یقین ایک رویہ تھا اور اصول ایک عادت۔

اس وقت اس کے ہاتھ میں Letter of saint Augustine موجود تھی۔ جسے وہ ہر صبح ناشتے سے پہلے پڑھا کرتا تھا۔

کرسی کے عقب میں کھڑا ملازم ہاتھ میں جیل لیے اس کے گردن تک آتے بال سمیٹ کر ایک ترتیب سے جما رہا تھا۔

ملازم نے کنگھی کو بے حد نرمی سے آخری بار اس کے بالوں پر پھیرا۔ پھر مطمئن ہو کر میز سے قیمتی پرفیوم کی نیلی شیشی اٹھائی جس پر سنہری کام سے maison royale لکھا تھا۔

شیشی کے منہ سے نکلتی پھوار پہلے اس کی گردن، پھر کندھوں اور آستینوں کے قریب ہولے سے ڈالی۔ اپنا فرض ادا کر کے وہ ایک طرف ہٹ کر مؤدب سا ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا

۔

اتنی دیر میں ایڈورڈ چپ چاپ کمرے کے کونے سے چاندی کی چھوٹی سی تشتری میں ایک کپ رکھ چکا تھا جس میں تازہ تیار کی گئی ایرل گرے چائے کی مہک آ رہی تھی۔ کپ کے کنارے پر لیموں کا پتلا سلائس رکھا گیا تھا۔ بالکل ویسا۔ جیسا نکولس کو پسند تھا۔

"مائی لارڈ! فادر کی طرف سے آرڈر ملا ہے کہ ناشتے سے پہلے آپ ایک بار ان سے ملاقات کر لیں" وہ ہاتھ باندھ کر احترام سے بولا۔ نکولس نے کتاب کی سطروں سے نظریں ہٹا کر ایڈورڈ کو دیکھا۔

اب اس کی آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ آنکھیں سبز تھی۔ جیسے کسی سنبھلے ہوئے طوفان کا عکس ہوں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں سب کچھ کہہ کر بھی خاموش رہتی ہوں۔

"اوکے" اس نے سر واپس جھکا دیا۔

سب کچھ مکمل تیار تھا۔ چائے پی کر اسے نیچے جانا تھا۔ جہاں فادر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پتہ تھا آج کا دن اس کا مصروف گزرے گا۔ رات کے لیے ابھی بہت سی تیاریاں رہتی تھی۔ ملازموں کی چاہے کمی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ایسے بہت سے کام تھے جو صرف وہی کر سکتا تھا۔ ابھی تو اسے اپنی تقریر یاد کرنی تھی جو فادر نے رات کی تقریب میں کرنے کو کہا تھا۔

فلحال وہ اپنی نظریں مسلسل کتاب پر جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں صفحوں کو الٹا رہی تھی تو دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اب شیشے کے کپ کا ہینڈل تھام چکیں تھی۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

دن نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ پردے کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اجالا بھی کونے کھدروں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب بس چاند تھا اور اس کے گرد پروانوں کی طرح جھومتے ستارے جو سیاہ آسمان کی چادر کو چمک دار موتیوں کی طرح آراستہ کر رہے تھے۔

اوسلو کے پوش علاقے فروگنر میں بھی رات اپنے جوبن پر آچکی تھی۔ ایسے میں وہ مسلسل فون کان سے لگائے ایک کمرے کی حدود کے اندرِ ادھر سے اُدھر چکر کاٹ رہی تھی... بستر کی چادر کی ایک شکن کے کنارے کھلی کتاب پڑی تھی... جس کے صفحات نیم وا تھے اور ٹھیک کنارے کے ساتھ ایک آئی ڈی کارڈ چپکا ہوا تھا۔

آج اسے گوسپل پڑھتے چوتھا دن تھا کہ اچانک ورق پلٹتے ہی ایک آئی ڈی کارڈ نکل آیا۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے اسے ایک بک مارک کی طرح استعمال کیا گیا ہو۔ اور کلارا کی نفیس طبیعت پر یہ چیز بجلی کی طرح گراں گزری تھی۔ وہ حیرت سے اس آئی ڈی کارڈ کو دیکھتی رہی جس کے اوپر ایک چھوٹی تصویر کی مدھم چھایا نظر آ رہی تھی اور ایک کونے کی سمت چھپے چھپے انداز میں ایک نمبر بھی درج تھا۔ شاید یہی نمبر ایک اشارہ تھا کہ اگر جو یہ کھو جائے تو اسے واپس کرنے کے لیے اس نمبر پر رابطہ کیا جائے۔

اس نے ایک بار پھر کان سے لگے فون کی طرف توجہ کی۔ یہ آخری بار تھا... اگر اب بھی کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دل کی گہرائی سے ٹھان لیا کہ وہ یہ کارڈ کھڑکی سے باہر پھینک دے گی۔

ایک...دو... تین...چار...

وہ کارڈ اٹھا کر کھڑکی کی طرف جاتے چار قدم چلی تھی۔ کھڑکی بس دو قدموں کی دوری پر تھی جب کال اٹھالی گئی۔ اس نے شکر کا سانس لیا۔ کارڈ کو دھیان سے اپنی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے وہ واپس بستر پر بیٹھ گئی۔

"ہیلو" آواز فون کے اس پار سے آئی تھی۔ کلارا نے خاموشی اختیار کی۔

"کون ہے ؟" دوبارہ آواز ابھری۔ لیکن کلارا کی طرف سے جواب ندارد۔ اتنی دیر سے کال اٹھانے کا بدلہ وہ اب دیر سے جواب دے کر لے گی۔

اسے اندازہ تھا کہ آواز ایک بار مزید آئے گی۔ اور وہ آئی بھی۔ لیکن انسانی آواز کی صورت میں ہر گز نہیں۔

بلکہ ایک مختصر "ٹوں... ٹوں... ٹوں..." کی صورت میں۔

فون کا رابطہ کٹ گیا تھا۔

وہ جو اپنے زعم میں بیٹھی تھی حیران ہوئی۔ اس نے گھور کر فون کو دیکھا۔ یہ اس کی تذلیل تھی کہ کوئی اس کا فون کاٹ دے۔ اس نے جھٹ سے دوبارہ کال ملائی۔ بات انا پر آ گئی تھی

۔

اس بار زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ کال اٹھالی گئی تھی۔

"آپ کا آئی ڈی کارڈ آپ کے پاس ہے؟" بغیر بات گھمائے اس نے مدعے پر آتے خود ہی پہل کر دی۔ آواز سنجیدہ تھی۔

"سوری؟" دوسری طرف وہ گہری نیند کے زیر اثر تھا جسے اس کی بات سمجھ ہی نہیں آئی۔

کلارا تیورا کر رہ گئی۔ وہ اس کی آسانی کا سوچ کر اسے فون کر رہی تھی۔ ڈرائیونگ یا کسی بھی طرح کے کام میں آئی ڈی کی ضرورت تو اسے روز پڑ سکتی تھی۔ لیکن یہاں فرق کسے پڑ رہا تھا؟ وہ تو اپنا آئی ڈی کارڈ بک مارک سمجھ کر بھول چکا تھا۔

"مسٹر سالوے آپ کا آئی ڈی کارڈ میرے پاس ہے۔ یقیناً آپ اسے بک مارک سمجھ کر بھول گئے ہیں" اس کا نام تو وہ کارڈ سے پڑھ چکی تھی۔ اس لیے چیخ کر بولی۔

نیند میں جھولتے سالوے پر ایک دھماکہ ہوا تھا۔ اپنے بستر پر لیٹا وہ اچھل کر سیدھا ہوا۔ نیچے اترتے ہی ایک ہاتھ سے گردن اور کان کے درمیان فون کو جمایا اور دوسرے ہاتھ سے ہک کے ساتھ لٹکی پینٹ سے اپنا والیٹ نکال کر کھول لیا... لیکن... وہ خالی تھا۔ آئی ڈی کی جگہ ایک خالی خانہ اسے منہ چڑا رہا تھا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اتنی بڑی لاپرواہی وہ کیسے کر سکتا تھا؟

"مس... آپ مجھے یہ پارسل کر سکتی ہیں؟ یا پھر ایڈریس بتا دیں۔ میں خود لینے آجاؤں گا" اس نے قدرے لجالتے انداز کے ساتھ کہا۔

ایک نظر دیوار پر ٹنگی ٹک ٹک کرتی گھڑی کو دیکھا جو رات کے ساڑھے تین کا ہندسہ بجا رہی تھی۔

اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ لیکن شبہ تھا کہ کارڈ وہ کتاب میں رکھ کر نکالنا بھول گیا ہو گا۔ دل ہی دل میں اس نے تھیو کو کوسا۔ کیسا بددیانت لائبریرین تھا جو کتاب کی چھان بین بھی ٹھیک سے نہیں کرتا تھا۔ بس فری میں بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ جبکہ اگر اس کی اپنی نیند

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

کا خمار چھٹتا تو یاد آتا کہ یہ کتاب اسی کی وجہ سے کلارا کے پاس گئی تھی۔ تھیو اس معاملے میں معصوم تھا۔

"میں کیوں پارسل کرواؤں ؟ اب پارسل آفس کے دھکے نہیں کھا سکتی میں۔ آپ کارڈ خود آ کر لیں"

اپنے کمرے میں کھڑے سالوے نے بے اختیار اپنا سر پکڑا۔ ساری نیند بھک سے اڑی تھی۔ مسٹر مارکس کی پریشانی کم تھی جو یہ بھی اسے پریشان کرنے آ گئی تھی۔ وہ اسے کہہ چکا تھا ایڈریس بتا دیں۔ لیکن وہ پھر بھی بھڑک رہی تھی۔

"ایڈریس؟" وہ ضبط کرتے بولا۔

"یونیورسٹی آف اوسلو....بلنڈرن" اس نے مختصراً کہا... اور ایک اطمینان کی سانس لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

پہلے اس نے کال کاٹی تھی۔ اب کلارا نے اپنا حساب خود ہی برابر کر لیا تھا۔

اس کی خاتون طبعیت اب مطمئن تھی۔

آئی ڈی کارڈ کو سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر، اس نے دراز کھولا اور احتیاط سے ایک کونے میں رکھ دیا۔ ہوا سے کتاب کے صفحے پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ کلارا نے کتاب اپنی گود میں رکھی اور قریب رکھے بیگ سے ایک رجسٹر نکال کر کچھ لکھنے لگی۔ یہ اس کی یونیورسٹی کا کام تھا جو گوسپل سے تعلق رکھتا تھا۔

کمرے میں روک لائیٹس، بلب، لیمپ، حتیٰ کہ ہر طرح کی روشنی روشن تھی۔ اب وہ بغور ایک سطر کو پڑھتے ہوئے، اپنے ہاتھوں میں پکڑے قلم سے لکھتی جا رہی تھی۔ اس نے قلم کو آہستہ آہستہ کاغذ کی سطح پر پھیرا... الفاظ ایک ایک کر کے جنم لینے لگے... یہ کوئی عام کام نہیں تھا... یہ ایک اہم تفصیل کی چھان بین کی کوشش تھی... ایک لازمہ... جو بہت احتیاط... دل کی گہرائی... اور توجہ کی طاقت مانگ رہا تھا۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

موسیقی کی نرم دھن سارے میں گونج رہی تھی۔ گریٹ چیپل ہال کو اعلیٰ ترین سجاوٹ سے سجایا گیا تھا۔ہال کے ایک طرف آرکسٹرا بیٹھا وائلن کا ساز بجا رہا تھا۔ سیاہ رنگ کا یونیفارم پہنے ویٹرز ہاتھ پر نازک گلاسوں کی ٹرے پکڑے ادھر ادھر گھوم کر مہمانوں کو مشروب سرو کر رہے تھے۔

ہال کی چھت سے آویزاں فانوس کی قلمیں نیچے کی محفل کو ایک مدھم سنہری روشنی کی بارش کی طرح روشن کر رہی تھیں۔

مہمان خوش گپیوں کی بھول بھلیوں میں محو تھے۔ کوئی آہستہ آہستہ ہنس رہا تھا کوئی سرگوشیوں کی صورت گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن سب کی نگاہیں ایک محور کی طرح ایک شخص کی طرف بار بار پلٹتی تھیں۔

آج یہ تقریب اس کے پچسویں جنم دن کی خوشی میں رکھی گئی تھی۔

سیاہ رنگ کی ٹیکسیڈو پہنے، بال جیل سے جمائے وہ فادر جاناتھن کے ہمراہ ایک مہمان کے پہلو میں کھڑا مدھم مسکراہٹ چہرے کی زینت بنائے ہوئے تھا۔

اس کے انداز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک زاویہ، شاہزادے کی تمکنت کو اجاگر کر رہی تھی۔ چاہے وہ کمر کے پیچھے ایک ہاتھ باندھ لینے کی ادا ہو... چال کی بے نیازی... یا گفتگو کا مختصر لیکن باوقار انداز۔

وہ رسمی سی مسکراہٹ سب کی طرف اچھال کر "ہیو آ گڈ ٹائم" کہتے، مارٹن کے پاس آ کر رک گیا۔

وہ اس کا فرسٹ کزن تھا۔ مارٹن کے والد اور فادر جاناتھن کے درمیان اکثر اختلافات رہتے تھے جن کی شدت وقتاً فوقتاً خاندان پر بھی اثرانداز ہوتی۔ لیکن ان سب کے برعکس نکولس اور مارٹن کی دوستی کا رشتہ الگ طرح کا تھا۔ ان میں ایسی ہم آہنگی تھی جو اختلافات سے بالاتر تھی۔

گھنگھریالے بالوں والا مارٹن اس وقت ہال کے ایک کونے کی وکٹورین طرز کی کرسی پر آرام سے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں لکڑی کی تراش پر پھسل رہی تھیں۔

نکولس کی آمد پر وہ کمر سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔

"آج واپسی میں بہت دیر کر دی تم نے" اپنے ساتھ رکھی کرسی پر نکولس کو نشست سنبھالتے دیکھ وہ فوراً بولا تھا۔ آنکھوں میں چھیڑنے کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔

نکولس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے کوٹ کا بٹن کھولا۔ پھر ریلیکس ہو کر بیٹھتے کمر کرسی کی پشت سے لگا دی۔

وہ اب تک مہمانوں سے ملتا رہا تھا اور اب صرف چند لمحوں کی خاموشی چاہتا تھا۔ اور بھلا مارٹن کی موجودگی میں یہ چیز ممکن ہو سکتی تھی؟ نہ.... کبھی نہیں۔

"واپسی جلدی ہو یا دیر سے... کیا فرق پڑتا،مارٹن؟اسی پر شکر کرو کہ میں آ گیا" وہ بے پرواہ سا لگا تھا۔

مارٹن کی نظریں اس کے چہرے سے ہوتیں اس کے کوٹ کے بائیں جانب لگے اس بروچ پر گئیں جو اس خاندان کی پہچان تھی۔ وہ بروچ صرف اسی کو نصیب ہوتا تھا جسے اس خاندان کا وارث چنا جاتا تھا۔ سبز چمکدار پتھر... سونے کے فریم میں جگمگاتا ہوا...

اس نے بمشکل وہاں سے نظریں ہٹاتے سر جھٹکا۔

"دیر سے آنے میں اور جلدی آنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے" تصیح کرتے ذرا سی کرسی نکولس کی طرف موڑی لی۔ اب اس کا رخ پوری طرح اس کی طرف تھا۔ جیسے ساری توجہ اسے دینا چاہتا ہو۔

"ہوتا ہو گا۔ لیکن جسے فرق نہ پڑنا ہو اس کے لیے یہ فرق بے معنی ہوتا ہے"اس نے لاپرواہی سے کہتے آنکھیں موندلیں۔

یہ تقریب اتنی مختصر نہیں تھی۔ اس لیے اسے خود کو تروتازہ رکھنے کے لیے چند لمحوں کی استراحت درکار تھی۔

مارٹن نے ایک لمحے کو آنکھیں چاروں اور گھمائیں۔ پھر گلا کھنکھار کر واپس نکولس سے مخاطب ہوا۔

"لوگوں کی آنکھیں تمہارے انتظار میں بنجر ہو گئی ہیں۔اور تمہیں فرق ہی نہیں پڑ رہا؟"

جسے رتبہ مل جائے اس پر "مغروریت" کا تاج سجتا بھی ہے۔اس نے دل میں سوچا۔لیکن کہا نہیں۔

اگلے ہی لمحے نکولس نے بیزاری سے آنکھیں نیم وا کیں۔اس کا منہ بند کروانے کے لیے کاش کوئی چیز اس کے پاس ہوتی تو وہ ضرور اس وقت استعمال کرتا۔ظبط کرتے اس نے اکتاہٹ سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"میں یہاں کچھ دیر سکون سے بیٹھنے آیا ہوں،مارٹن۔لہٰذا کچھ دیر خاموشی اختیار کرو۔ورنہ اس وقت یہی میز تمہارے سر پر مارتا میں اچھا بلکل نہیں لگوں گا"

سر ہنوز کرسی کی پشت پر ٹکائے اس نے جس انداز میں یہ کہا تھا مارٹن نے بے ساختہ دانت پیسے۔وہ اس سے چند ماہ بڑا تھا۔لیکن مجال ہے جو وہ کبھی اسے خاطر میں لایا ہو۔

"یہ جو ساری دنیا تمہیں سلیقہ مند اور جینٹل مین سمجھتی ہے نا۔ کبھی مجھ سے پوچھیں تو تمہاری شان کے اصل قصیدے پڑھوں۔ پھر انہیں بھی تمہاری اصلیت پتہ چلے"

وہ یوں بولا جیسے ابھی تقریب میں آئے میڈیا کو جا کر اس کی ساری رپورٹ دے آئے گا۔

نکولس نے بے ساختہ ایک نظر میز کو دیکھا، پھر اسے۔ اگر اس کے آس پاس لوگ نہ ہوتے تو وہ اس میز کو اب تک مارٹن کے سر کی زینت بنا چکا ہوتا۔

لیکن فلحال کے لیے سر جھٹکتے اس خیال کو ترک کر دیا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ خاندان کے وقار کے لیے وہ اپنی اس خواہش کو قربان کر سکتا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ مجھے کسی کی باتوں سے فرق پڑتا ہو گا؟" مصروف سا کہتے اس نے دور کھڑے ویٹر کو اشارے سے بلایا۔

"فرق سب کو پڑتا ہے، میرے بھائی۔ بس کچھ ظاہر کر دیتے ہیں اور کچھ چھپانے میں ماہر ہوتے ہیں" شوخ سے مارٹن کے چہرے پر یکدم سنجیدگی چھا گئی۔

سیاہ ورزی پہنے ویٹر ان کی میز کے قریب آر کا۔اس کے ہاتھ پر رکھی چاندی کی تشتری میں بہت سے مشروب کے گلاس تھے۔ اس نے بغیر نکولس کے کچھ کہے ایک گلاس نفاست سے اٹھا کر سامنے میز پر رکھا اور واپس پلٹ گیا۔یہ سب اس کی معمول کی کارگزاری تھی۔

"فرق بات کرنے والے کی وقعت سے پڑتا ہے۔بات سے نہیں" نکولس نے گلاس تھام کر ابرو اٹھا کر اس کی تصیح کی تھی۔

میز پر اپنی انگلیوں سے دائرے بناتے مارٹن نے بیزاری سے ہاتھ جھلایا۔

جس پر بیتی ہو وہ جانتا ہے۔ نکولس کو ابھی تک اس چیز کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔اس لیے وہ آرام سے یہ کہہ سکتا تھا کہ کسی کو کسی کی کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

اس کی نگاہ ایک بار پھر اسی کونے میں جا ٹھہری جہاں سے وہ کافی دیر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں، بے اختیار... نظریں بھٹک بھٹک کر وہیں آ ٹھہرتی تھیں۔اس بار وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب تمہیں ڈسکس کر رہے ہیں۔ جھوٹ مت بولنا...سچ سچ بتاؤ۔ کیا تمہیں ان کی باتوں سے فرق نہیں پڑ رہا؟"اس نے اپنی توجہ کھینچنے والے اسی

ہجوم کی طرف اشارہ کیا جہاں چند لوگ ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

اس کے ہاتھ کے اشارے پر نکولس نے بھی گردن گھما کر دائیں جانب دیکھا۔ وہ خود کو کوئی غیر معمولی شخصیت نہیں گردانتا تھا۔ لیکن جس خاندان سے اس کا تعلق تھا وہاں مرکزِ نگاہ رہنا بہت عام سی بات تھی۔

"Not at all۔ مجھے فرق نہیں پڑ رہا"

اس کی آنکھوں میں انکھیں گاڑھ کر پتھر پر لکیر کھینچنے کے انداز میں کہا۔ آواز کے ساتھ الفاظ میں بھی پختہ یقین تھا۔

مارٹن نے استہزائیہ ہاتھ جھلایا۔ جیسے سامنے بیٹھا شخص کوئی نا سمجھ بچہ ہو اور اس نے نادانی میں کوئی بات کر دی ہو۔

" تم ان کی ڈسکشن کا حصہ ہو۔ اب تک سب کے نزدیک تمہارا امیج اچھا پورٹریٹ کیا گیا ہے۔ اس لیے تم اچھے لفظوں میں یاد کیے جاتے ہو۔ لیکن جس دن تمہارے بارے میں ایک

Clubb of Quality Content

بھی افواہ پھیلی تو تمہارے اس سینٹ ماسک کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ پھر پتہ چلے گا کہ لوگوں کی باتوں سے کس طرح فرق پڑتا ہے" دھمکی دیتا انداز۔ واضع بغاوت۔

نکولس ٹیک چھوڑ کر فوراً سیدھا ہوا۔ بات اب سنجیدگی کے آخری موڑ پر آ گئی تھی۔ لاپرواہی سے کی جانے والی بات ایسا رخ اختیار کر جائے گی اسے امید نہیں تھی۔

"بعض اوقات انسان کو کسی المیے کا کردار بننے کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑتا، صرف اس کا پیدا ہو جانا ہی کافی ہوتا ہے، مارٹن۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی پیدائش کے انجام کو اپنی آنکھوں سے مکمل ہوتا دیکھوں۔ اٹس ناٹ آ بگ ڈیل فار می" گویا وہ پہلے ہی تیار تھا۔

مارٹن نے لب بھینچ لیے۔ مٹھیاں سختی سے بند کیں۔ آنکھوں کا مرکز ابھی بھی وہی ہجوم تھا جو وقتاً فوقتاً ان کی میز کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ جب وہ یہاں اکیلا تھا تب کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا، لیکن جب سے نکولس آ کر یہاں بیٹھا تھا تب سے وہ ہجوم جیسے اس میز پر مرکوز ہو گیا تھا۔

آخر ان سب کی توجہ کا مرکز نکولس ہی کیوں تھا؟ اندر دل میں کہیں انجانی سی آگ بھڑکنے لگی جو اس کے عصابوں پر اپنا تسلط جمانے لگی۔

"تمہیں ان نظروں سے بھی فرق نہیں پڑتا؟" لہجہ عجیب تھا۔ کھٹکتا ہوا۔

اسے بعض اوقات ایسے عارضی جذباتی اختلال کا سامنا ہوتا تھا۔ جب اس کی فطری شگفتگی پس منظر میں چھپ جاتی تھی اور وہ تلخی کڑواہٹ اور بے زاری کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اسی کیفیت کے اثر میں اس لمحے بھی حسد کی ایک تیز لہر اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔

نکوس کا جی چاہا کہ بس یہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ گم ہو جائے۔ کھو جائے۔ اسے مارٹن کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"تم لوگوں کو کیوں اپنی بات کا مرکز بنا رہے ہو، مارٹن؟ ان نظروں میں اور لوگوں کی باتوں میں کچھ بھی تو خاص نہیں ہے۔ نظر تو کسی پر ٹک جایا کرتی ہے۔ باتیں تو کسی کے بھی متعلق کی جا سکتی ہیں۔ اس سے مجھے فرق کیوں پڑے گا؟"

اسے یہ مسلسل ایک ہی تکرار پسند نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک کوفت میں مبتلا کرنے کا موضوع بن چکا تھا۔ وہ بس اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔

"انسان جیسا بھی ہو۔ کم از کم منافق تو نہ ہو...."

الفاظ تھے کہ نشتر۔ نکولس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ وہ ہل تک نہ سکا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے پیارے کزن کی اگلی بات اس کی زبان کو وہیں روک گئی۔

"تم خود کو ایسا پوز کرتے ہو۔ جان بوجھ کر۔ تاکہ لوگ تمہیں دیکھیں۔ تمہیں لوگوں کی نظروں کا مرکز بننے میں تسکین ملتی ہے" خود کو پرسکون کرنے کے لیے وہ یونہی نکولس کے بخرے ادھیڑ دیتا تھا۔ جیسے ابھی پوری دلجمعی سے یہ کام سرانجام دے رہا تھا۔ بغیر کسی لحاظ کے۔

نکولس ساکت نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ سامنے بیٹھا شخص اس وقت کتنا اجنبی لگا تھا۔

"اور کچھ؟"

لہجہ ٹھنڈا ٹھار تھا۔ تیکھے برطانوی نقوش تن گئے تھے۔

مارٹن کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ نکولس اس سے نہ بھی پوچھتا تو اس نے مزید کہنا ہی تھا۔

"اور یہ کہ تم ایک پیپل پلیشر (people pleasure) ہو۔ تم لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ویسا بنتے ہو جس سے لوگ تمہیں سراہیں.... تم میں اور مجھ زیادہ فرق تو نہیں ہے۔ لیکن تمہاری اس جھوٹی فطرت کی وجہ سے ساری لائم لائٹ تمہیں مل جاتی ہے۔ ورنہ میں بھی تو یہیں ہوں" اس نے اپنے سینے پر دستک دی۔

"لیکن یہ نظریں تم پر ہی ٹک رہی ہیں۔ کیوں؟ کیا صرف تم ایورہارٹ کے فرد ہو؟ میری رگوں میں ایورہارٹ کی جگہ کوئی اور خون دوڑ رہا ہے کیا؟"

آواز میں اب حسد کی بو تھی۔ نکولس بغیر آنکھیں جھپکائے اسے دیکھتا گیا۔

کیا ایسا شکوہ بنتا تھا؟ کیا اس کا لوگوں کی نظروں پر اختیار تھا؟

دل میں ہمیشہ کی طرح وہی خدشہ سر اٹھانے لگا کہ کہیں وہ اور مارٹن بھی ڈیوڈ اور جاتھن کی طرح حریف نہ بن جائیں۔

اندر کہیں اسے خوشفہمی یا امید تھی کہ وہ اسے جانتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ مارٹن کا حسد باقی لوگوں کی طرح نقصان دہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بس بے ضرر سی جلن تھی جو ہر انسان میں غیر ارادی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر مارٹن کے منہ سے اگلے گئے زہر کا اثر ذائل کرنے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

"میں کوئی تھیورم نہیں ہوں مارٹن جو خود کو تمہارے سامنے پروو کروں....اس لیے میں اپنی کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ تم نے مجھے جو سمجھنا ہے سمجھو"

اپنی ذات پر کیے جانے والے کسی بھی تبصرے کا جواب وہ نہ کبھی کسی کو دیتا تھا اور نہ ہی اسے ضرورت تھی۔

"دوسری بات...." افسوس سے اپنے تایا کے بیٹے کو دیکھا۔ وہ اس وقت نہ مارٹن تھا نہ اس کا دوست۔ فلحال وہ صرف اس کے تایا کا بیٹا تھا۔ حسد کرنے والا، بغض رکھنے والا۔

"میرا کسی کی زبان یا نظروں پر کنٹرول نہیں ہے۔ لوگوں کو چمکتی چیزیں پسند آتی ہیں۔ اور اس وقت وہ جس روشنی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں وہ اس تاج سے پھوٹ رہی ہے جو میرے سر پر سجایا گیا ہے" اس کی آواز نرم تھی۔ لیکن اس میں ایک سنجیدگی بھی تھی۔

"یہ لوگ نکولس ایورہارٹ کو نہیں دیکھ رہے۔ یہ ایورہارٹ کے وارث کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی یہی نظروں کا ہجوم اسی کے گرد جمع ہوتا"

مارٹن کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ چہرے پر تحقیر کا سایہ لہرایا۔ رویہ زخمی کر دینے والا تھا۔ لیکن نکولس اس وقت اسے سمجھانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ بولتا گیا۔

"ایک مخلص بھائی ہونے کی حیثیت سے میں تمہیں یہی کہوں گا کہ تم ان تحسین بھری نگاہوں کی پیاس مت پالو۔ یہ سب وقتی چمک ہے۔ ایک عارضی سراب۔ وقت بدلتے ہی یہی نظریں سب سے پہلے پہچان سے منکر ہوتی ہیں"

"واٹ ایور!" مارٹن نے بے نیازی سے ہاتھ جھٹکا۔ نکولس کے الفاظ اس کے نزدیک محض ردی کے کاغذ پر بکھرے بے معنی جملے تھے جن کا کوئی وزن، کوئی وقعت نہیں تھی۔

"تم سمجھ کیوں نہیں رہے ؟" اب کی بار وہ مضطرب ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک بے قراری بھی در آئی۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ سامنے بیٹھا شخص ایسا نہیں تھا۔ جو شخص فطرتاً اچھا ہو اس کا بدل جانا زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ بہ نسبت اس کے جو پہلے سے برا ہو۔

اسے اپنا اور مارٹن کا رشتہ جاناتھن اور ڈیوڈ جیسا نہیں بنانا تھا۔ صرف اسی بندھن کو بچانے کے لیے وہ ہمیشہ اس کے سامنے خود کو ذرا جھکا لیا کرتا تھا۔

"تمہیں اس واہ واہ کی گونج میں اپنے آپ کو گم نہیں کرنا،مارٹن۔ تم اس احساس کمتری سے باہر نکل آؤ جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے۔ خاص طور پر تم جیسے بے لوث انسان کو ان چیزوں سے فرق نہیں پڑنا چاہیے" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ نظریں گہرے انداز میں مارٹن کے چہرے پر جم گئیں۔ مقابل کی آنکھوں میں ایک تناؤ تھا۔ اور نکولس کا مقصد اسے ختم کرنا تھا۔

" میری ایک بات یاد رکھو..." وہ کچھ جھکا۔ ایک فیصلہ لیتے ہوئے۔ مارٹن کو نکولس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اپنے کزن جیسے بھائی کو اس حسد سے کیسے چھٹکارا دلوانا تھا۔

اس نے مارٹن کا بازو تھام کر ہلکا سا دبایا۔ جیسے اسے مکمل طور پر خود کی طرف متوجہ کر رہا ہو۔ مقابل چاہتا تو اس کا ہاتھ جھٹک سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنی فطرت سے ضرور ہٹا تھا۔ لیکن اپنا اصل نہیں بھولا تھا۔

Clubb of Quality Content

"تم ایورہارٹ کا حصہ اس وقت سے ہو مارٹن جب نکولس کا اس دنیا میں نام و نشان تک نہیں تھا۔ دنیا چاہے جو مرضی سمجھے۔ لیکن تم یاد رکھو.... تم نکولس سے افضل ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟...."اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

"تم نکولس سے افضل ہو۔ اور یہ بات وہی نکولس تم سے کہہ رہا ہے جسے دیکھ کر تمہیں خود پر شک ہوتا ہے"

وہ اس کا بازو چھوڑ چکا تھا۔ جیسے بات کا اختتام کر چکا ہو۔

مارٹن کی سخت نظریں اسی پر جمیں تھی۔

لیکن پھر....

"تم نکولس سے افضل ہو"

"تم نکولس سے افضل ہو"

اس نے اس جملے کو اپنے ذہن میں بار بار دوہرایا۔

Clubb of Quality Content

یہ وہ جملہ تھا جو اس کے تناؤ میں دراڑ ڈال گیا۔ آنکھوں کی سختی یکایک ہی نرمی میں بدلنے لگی۔ لبوں کی کساوٹ ڈھیلی پڑ گئی۔ نگاہوں میں ایک چمک سی ابھری... تعریف کی چمک، تسلیم کیے جانے کی چمک۔

"آئندہ کوئی ایسی بات مت کہنا جو تمہیں زیب نہ دے" نکولس کہہ رہا تھا۔ یہ جملہ تنبیہہ سے زیادہ اعلان تھا۔

مارٹن نے اس کے دھونس جمانے پر ابرو سکیڑے۔ لیکن چمک ہنوز قائم تھی۔

"Now just cut the crap"

الفاظ کا اثر ہو چکا تھا۔ حسد جو مارٹن کے شفاف دل میں چپکے سے جگہ بنائے بیٹھا تھا آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگا۔ آنکھوں میں زندگی کی لہر لوٹنے لگی۔ تناؤ کا وہ بوجھ جو ان کے درمیان خاموشی سے بیٹھا تھا خود بخود ہٹنے لگا۔

اب وہی پرانا مارٹن سامنے بیٹھا تھا... شوخ، ہنس مکھ، اور نکولس کو چھیڑنے والا دوست۔

"دادا کہتے تھے جنہیں یونہی عنایتیں میسر ہوں ان میں قدردانی کا سلیقہ نہیں ہوتا...." اسے نکولس کی باتوں سے اپنے بزرگ کا ایک قول یاد آیا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

کہتے ہوئے اس نے اپنا خالی گلاس ایک طرف رکھ کر معمول کے مطابق نکولس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس میں سے ایک گھونٹ بھرا۔

نکولس نے اس عمل پر اسے خاموش ناگوار نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے ہمیشہ مارٹن کی یہ حرکت سخت ناپسند تھی۔ وہ ہمیشہ اپنا گلاس ختم کرنے کے بعد اس کا گلاس اٹھا لیتا تھا۔ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی۔ اور عادتیں ہو نہی نہیں جایا کرتیں۔

"تمہیں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ دادا کی یہ بات بھی باقی کی ان گنت باتوں کی طرح درست ہی تھی" اس کی بات کے اختتام پر اب کی بار نکولس نے کندھے اچکا دیے۔

وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ اگر دادا کا قول درست تھا تو فیصلہ بھی درست مان لو۔ لیکن وہ نہیں کہہ پایا۔ بات مزید بڑھنے کا خدشہ تھا۔ لہٰذا خاموشی ہی بہتر تھی۔

وہ جس موضوع کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا باب وہ دونوں ہی ہمیشہ کے لیے بند کر چکے تھے۔

بہت ہو گئیں یہ فضول باتیں۔ اب مزید نہیں... اب اسے آرام کرنا چاہیے تھا۔

وہ واپس سر کرسی کی پشت سے ٹکا گیا۔ مارٹن نے بھی مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ نکولس کے گلاس سے گھونٹ بھرتا ہوا ارد گرد دیکھنے لگا تھا۔ اب لوگوں کی نظریں اسے نہ جھنجھوڑ رہیں تھی اور نہ ہی احساس کمتری محسوس کروا رہیں تھی۔

فضا میں وائلن کی دھن اپنی مخصوص لے پر بجنے لگی تھی۔ یہ دھن کس نے فرمائشی طور پر بجانے کو کہا تھا۔ جو فہرست نکولس نے آرکیسٹرا کو دی تھی ان میں یہ کہیں بھی نہیں تھی۔ نکولس نیم دراز سا ہو کر اب پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا جب اچانک ایک سرسراتی سی آواز اسی ہجوم سے سنائی دی جس سے کچھ لمحے پہلے وہ مارٹن کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

Clubb of Quality Content

وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ آواز سرخ رنگ کے گاؤن میں ملبوس اس لڑکی کی تھی جس کے ساتھ کچھ دیر پہلے وہ رسمی گفتگو کر کے آیا تھا۔

رچرڈ خاندان کی اس لڑکی کا اپنا خاندان بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس کا باپ ملک کے وزیران میں ایک اہم عہدہ رکھتا تھا۔ اس ہجوم میں کھڑی اس لڑکی کا درجہ باقیوں سے کہیں زیادہ بلند

تھا۔ اس کی شخصیت بھی باقیوں سے جدا تھی۔ اسی وجہ سے اس کی گردن بھی باقیوں کی بجائے زیادہ شان سے اٹھی ہوئی تھی۔ اور یہ اٹھی گردن اس پر جچ بھی رہی تھی۔

نکولس نے غیر ارادی طور پر اپنے ذہن میں اس نام کو یاد کیا۔ چند نام گڈمڈ سے ہوئے... ازیلیا، لومیلیا، ایمالیہ۔

نہیں... اسے اتنا یاد تھا کہ ان ناموں میں اس لڑکی کا کوئی بھی نام نہیں تھا۔

پھر یکدم اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔

"AIM"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

ہاں... اسے اب یاد آیا تھا۔ اس نے جب اس کا نام سنا تھا تب اس کے ذہن میں ایم کا لفظ ہی گونجا تھا۔

اس نے اپنے دماغ میں جوڑ توڑ کیے۔ اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے لفظ پزل کی صورت جڑ کر ایک نام بن گئے۔

"ایمیلیا"

یہ نام ٹھیک اس لڑکی کا تھا جس کی آواز اسے ابھی سنائی دی تھی۔ نکولس نے اپنے ذہن میں بے ساختہ اس نام کو دوہرایا... ایمیلیا... ایمیلیا رچرڈ۔

وہ اسی متعلق سوچ رہا تھا جب ایڈورڈ مودب سا چلتا ہوا آیا اور اس کے کان کی طرف جھک کر کوئی سرگوشی کی۔

اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولی۔ نگاہیں سیدھی اسٹیج کے قریب کھڑے فادر جانتھن سے ٹکرائیں جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ اشارہ کر رہے تھے۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایڈورڈ کو جانے کا اشارہ کیا اور فادر کو دیکھ کر سر کو ہلکا سا خم دیا۔ گویا پیغام پہنچا دیا۔

"ابھی آرہا ہوں"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ جیب میں اٹکے سفید رومال کو ہلکا سا انگلیوں سے چھو کر واپس جگہ پر جمایا۔ اور جاتے جاتے ایک بار پھر مارٹن کی طرف جھکا۔

"سپاٹ لائٹ کی روشنیوں میں سب کی نظریں جب مجھے دیکھیں تو غیر آرام دہ مت ہونا۔ یاد رکھنا.... دنیا روشنیوں میں رہنے والوں کو دیکھتی ضرور ہے لیکن سراہتی نہیں ہے"

Clubb of Quality Content

اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ لیکن بات مزاح کی حد تک تھی۔ لبوں پر تبسم بھی تھا جسے وہ دبا رہا تھا۔
اب کی بار مارٹن کا دل کیا یہی میز اٹھا کر اسے دے مارے۔ صاف ظاہر تھا وہ ابھی کچھ دیر پہلے والی بحث پر طنز کر رہا تھا۔

نکولس اس کی سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔

یکدم ساری روشنیاں گل کر دی گئیں تھی۔ ایک دائرے کی صورت دودھیا روشنی اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ سٹیج پر چڑھنے والے چند زینے پار کر کے اوپر پہنچا۔

آرکیسٹرا کی دلفریب دھن کے ساتھ سب مہمان اس کے لیے سالگرہ کا گیت گنگنانے لگے تھے۔

فادر جانتھن نے اس کی طرف روشنیوں میں چم چم کرتی سرخ ربن سے بندھی ہوئی چھری بڑھائی جسے اس نے نرمی سے تھام لیا۔

یکدم وائلن کے ساتھ مہمانوں کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

اس نے چھری کیک پر رکھ کر اس ریڈ ویلوٹ کیک کا ایک تکون کی شکل کا ٹکڑا کاٹا۔

یہ اس کا پسندیدہ کیک تھا۔ وہ ہر سال یہی کیک اپنی سالگرہ کے لیے خاص طور پر منگواتا تھا۔

اسے آج ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح اپنی ماں یاد آئی۔

یاد آنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی رخصت ہو گئیں۔

ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ایک نگاہ حاضرین پر دوڑائی۔ سب کی نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔ قیمتی پوشاکوں میں ملبوس اشرافیہ اسے مبارکباد پیش کر رہے تھے، جس کا جواب سر کے خم سے دیا جا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر اچانک ایک فلیش کی چمک پڑی۔ فوٹوگرافر اس کی جھکی گردن کے ساتھ مسکراہٹ کو ایک دائمی تصویر میں قید کر چکا تھا۔

Clubb of Quality Content

دور مجمع سے ہٹ کر مارٹن اپنے ہاتھ جیبوں میں گھسیڑے اسے تکتا رہا۔

یہ مقام کبھی اس کی قسمت میں لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ مقدر نے نکولس کو ہی اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسی لیے یہ عہدہ خود بخود اس کی جھولی میں آن گرا تھا۔ یہ رتبہ اسی کے نصیب کا حصہ تھا۔

اگر ماضی کی وہ ایک غلطی نہ ہوئی ہوتی تو آج یہی حال ،یہی چمک مارٹن کی تقدیر ہوتی۔خیر... وقت فیصلہ کر چکا تھا۔اس لیے اب اس کے بارے میں سوچنے کا فائدہ نہیں تھا۔

نکوس نے بلند آواز میں "تھینک یو" کہا اور دھیرے دھیرے فادر جانتھن کے قریب آیا۔اس کے قدموں کی چال مکمل طور پر ہموار تھی۔

وہ ان کے بلکل سامنے آ کر رکا۔

کبھی فادر جانتھن کے کندھے تک پہنچنا اس کا خواب تھا۔لیکن اب وہ ان سے بھی اونچے قد کا مالک بن چکا تھا۔فادر جانتھن کے چہرے پر جھریاں آ گئیں تھی اور نکوس نے جوانی کی باگ سنبھال لی تھی۔وقت وہی تھا۔بس کرداروں نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔

اس نے سرخ رنگ سے سجے کیک کا ٹکڑا آہستگی سے ان کے لبوں کے قریب کیا۔

فادر نے اس کی حرکت پر چہرہ پیچھے کر کے تنبیہی نظروں سے باز رہنے کا اشارہ کیا لیکن نکوس نے ہاتھ پیچھے نہیں ہٹایا۔

وہ میٹھا نہیں کھاتے تھے اور وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا لیکن پھر بھی جان بوجھ کر کھلا رہا تھا ۔انہوں نے اس کی ضد پر برائے نام ہی کیک کو ہلکا سا دانتوں سے کتر کر اس کا وہی کیک والا ہاتھ تھام کر اس کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

نکولس مسکرایا۔ جیسے محظوظ ہوا ہو۔ ہونٹ کے دائیں جانب قریب ہی ہلکا سا خم پڑا۔

"او نہو... میٹھے سے صحت خراب ہوگی، فادر۔ آپ بھول گئے ؟"

اس نے بغیر کیک کا ذائقہ چکھے، ٹکڑا ساتھ کھڑے ملازم کے ہاتھ میں تھمایا اور اسٹیج کی طرف مڑ گیا۔ پیچھے کھڑے فادر جاناتھن اس کی حرکت پر بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ وہ ہر سال انہیں کیک کھلا کر خود نہیں کھاتا تھا۔

ریڈ ویلوٹ کیک اس کا پسندیدہ تھا۔ لیکن بس دیکھنے کی حد تک۔ ورنہ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ آخری بار اس نے میٹھا چکھا کب تھا۔

ہال کے کونے میں ڈیوڈ بیٹھے تھے۔ مارٹن کے والد۔ ایورہارٹ کی وہ شخصیت جو اس خاندان میں ہمیشہ ایک بے کلی سی پھیلا دیتے تھے۔ ان کا رویہ فادر جاناتھن سے کسی دشمن سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ برائے نام ہی صرف خاندان کے وقار کی وجہ سے یہاں

موجود تھے۔ انہوں نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ان کی شرکت ہی بہت تھی۔ یہ بھی نکولس کی امید سے بڑھ کر تھا۔ وہ ہر سال ناچاہتے ہوئے اس کی سالگرہ میں مجبوراً یونہی بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اختلافات اپنی جگہ لیکن وہ اپنے معاملات کی بھنک باہر کے لوگوں کو نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ مارٹن کے ذہنی انتشار کی بھی وجہ وہی بنتے تھے۔

نکولس اسٹیج پر کھڑا تھا۔ مائک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خطیب تھا اور سامعین وہاں موجود سب مہمان تھے۔

یہاں اس کے خاندان سے زیادہ امیر و کبیر لوگ آئے تھے۔ لیکن رتبہ پھر بھی ایورہارٹ خاندان کا بلند تھا۔

سب سے الگ تھلگ کھڑے مارٹن نے بھی اپنے ہاتھ میں پکڑا پولرائیڈ کیمرہ سیٹ کیا۔ ایک آنکھ بند کی۔ اور کلک کے ساتھ روشنیوں میں گھرے نکولس کی تصویر کھینچ لی۔

اس کے تصویر کھینچنے کے دوران ایک اور فلیش کی چمک ابھری تھی۔ لیکن یہ فلیش نہ تو کیمرہ مین کے کیمرے کا تھا اور نہ ہی مارٹن کے۔

Clubb of Quality Content

یہ اس کیمرے کی روشنی تھی جو اس ہجوم میں کھڑی سرخ لباس والی لڑکی نے تھام رکھا تھا۔ جیسے ہی تصویر کا عکس اس کے کیمرے پر نظر آیا۔ وہ مسکرائی۔ آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ ایسی چمک جو آنکھوں کو خیرہ کردے۔

اسٹیج پر نکولس اب بھی بول رہا تھا اور باقی اسے سن رہے تھے۔ کچھ لوگ جو اسے تھوڑا قریب سے جانتے تھے وہ اس سے پیانوں بجانے کی فرمائش کر رہے تھے جس پر وہ مسکرا کر حامی بھر رہا تھا۔

ایک بڑا سا پیانو اسٹیج کے وسط میں پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یقیناً وہ یہاں سب کو اپنی انگلیوں کے جادو سے نکلنے والی دھن میں جکڑنے والا تھا۔

فلحال کے لیے صرف وائلن کا ساز سر بکھیر رہا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ ہال کی روشنیاں آہستہ آہستہ بکھرنے لگیں۔ لیکن تقریب جاری تھی۔ اور جاری ہی رہنی تھی... اگلے کئی گھنٹوں تک۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

بلیک ویسٹ سے دور کہیں رات سیاہ تھی۔ سناٹا اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اپنی ہی سانسوں کی آواز کسی دور دراز گونج کی مانند محسوس ہوتی۔ گھر کے وسیع و عریض لان میں دو چھوٹے بچے

ایک پنجرے کے سامنے کھڑے تھے۔ پنجرے میں قید رنگ برنگے طوطے خاموش اور نڈھال بیٹھے تھے گویا بھوک سے ہار مان چکے ہوں۔

دونوں بچوں نے پنجرے کے دونوں اطراف میں رکھی چھوٹی ڈبیوں میں احتیاط سے دانہ اور پانی ڈالا۔ جیسے ہی آخری چمچ میں دانہ بھر کر انہوں نے ڈبی میں گرایا، طوطے ایک ساتھ لپک کر اس کی طرف بڑھے جیسے زندگی لوٹ آئی ہو۔

آج وہ خوراک دینا بھول گئے تھے... اور اب احساس ذمہ داری ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی کے ساتھ ابھرا ہوا تھا۔ خاموشی کے عالم میں صرف دانہ چگنے کی آواز اور بچوں کی دھیمی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔

"ہم نے ان پر ظلم کیا نا؟"

چھوٹے لڑکے نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں ندامت تھی۔ سیاہ آنکھیں رات کی تاریکی کی مانند گہری اور افسردہ تھیں۔ وہ پنجرے میں قید طوطوں کو دیکھ رہا تھا جو دانے پر جھپٹ رہے تھے ایک دوسرے سے لڑتے چونچ مارتے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"نہیں تو" بڑے لڑکے نے کندھے اچکائے۔ "ہم نے بس دیر کی ہے۔ کوئی ظلم نہیں"

"نہیں.... ہم نے ظلم کیا" چھوٹا لڑکا بضد تھا۔ پھر وہ یکدم اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ ایک غیر متوقع سانحے کی طرح۔

اس کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

"ہم نے انہیں بھوکا رکھا... ہم نے ظلم کیا" اس کی آواز سناٹے میں گونج کر لوٹتی۔ جیسے رات خود اس الزام کو دہرا رہی ہو۔

"ششش..." بڑا بھائی خوراک سے بھری تھیلی ایک طرف رکھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا۔ وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے چپ کروانے لگا۔

"چپ کرو... ہم نے کچھ غلط نہیں کیا" اس نے اپنا بازو چھوٹے کے گرد لپیٹا۔

وہ دونوں بمشکل آٹھ یا دس سال کے لگتے تھے۔ مگر ان کی گفتگو میں جیسے صدیوں کی فہم سما گئی تھی۔

"فیرو (Pharaoh) بھی تو اپنی رعایا پر ظلم کرتا تھا۔ ان کا خیال نہیں رکھتا تھا" چھوٹے لڑکے نے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ طوطے ہماری رعایا ہیں۔ ہم نے بھی فیرو کی طرح ان پر ظلم کیا... ان کا خیال نہیں رکھا" بڑے لڑکے کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ وہ ساکت کھڑا چھوٹے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں یہ سوچ کہاں سے آئی؟ چھوٹے کی سسکیاں جاری تھیں۔

"اگر کل کو ہمارے اوپر بھی عذاب آگیا؟ اگر ہم بھی پانی میں ڈوب گئے تو؟" وہ لرزتی آواز میں کہتا رہا۔ بڑا بھائی اب بھی اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔

"ہم نے ظلم نہیں کیا... ہم سے لاپرواہی ہوئی ہے بس۔ اگر ہم ڈیڈ کے ساتھ باہر نہ جاتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ ہم کبھی بھی انہیں بھوکا نہ رکھتے" بڑے بھائی نے کہا اور اسے مضبوطی سے اپنی آغوش میں لے لیا۔

چھوٹا لڑکا اب کانپنے لگا تھا۔ اس نے نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں ستارے جھلکنے لگے تھے... چمک دار، صاف، شفاف۔

"انہیں آزاد کر دیتے ہیں" چھوٹے لڑکے نے آہستہ سے کہا۔ کسی عزم کے ساتھ۔

"جب ہم ان کا خیال نہیں رکھ سکتے تو ہمیں انہیں قید کرنے کا کوئی حق نہیں" وہ یکدم خود کو بڑے بھائی کی گرفت سے چھڑا کر پنجرے کی طرف لپکا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ بڑا بھائی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ طوطے ایک ایک کر کے پنجرے سے نکلنے لگے۔ پلک جھپکتے ہی سارے طوطے سیاہ آسمان میں پرواز کر چکے تھے .... آزادی کی طرف بے خوف اور بے صدا۔ انہیں رات کے اندھیرے جیسے خوف ہی نہ آیا۔

پیچھے صرف خالی پنجرہ رہ گیا تھا۔ اور وہ ڈبیاں جن میں دانہ اور پانی اب ختم ہو چکے تھے۔ طوطے اپنی بھوک مٹا کر جا چکے تھے۔

چھوٹا لڑکا مطمئن ہوتے پنجرے کا دروازہ بند کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرے پر ایک گہرا سکون پھیل چکا تھا۔

"ہم ان کا خیال رکھ لیتے نا۔ ڈیڈ اب اور پرندے نہیں لا کر دیں گے" بڑا لڑکا خفا ہوا۔ اس کی نظر خالی پنجرے پر جمی تھی۔ وہ پنجرہ جو کبھی رنگوں اور آوازوں سے بھرا رہتا تھا اب خالی تھا... خاموش اور بے جان۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

"ڈیڈ کہتے ہیں جب غلطی کرو تو اسے سدھارو۔ خود کو فضول جسٹیفکیشن سے مطمئن مت کرو"

چھوٹے لڑکے کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"تم اب بہانے ڈھونڈ رہے ہو۔ ہمیں پتا ہے ہم ڈیڈ کے ساتھ روز جایا کریں گے۔ پیچھے ان پرندوں کا خیال ہم نہیں رکھ پائیں گے۔ میں نے بس غلطی سدھاری ہے۔ اب یہ پرندے اپنی مرضی سے کھانا ڈھونڈ سکیں گے۔ انہیں ہمارے انتظار میں بھوکا نہیں بیٹھنا پڑے گا"

وہ دانے کی پوری تھیلی اٹھا کر لان میں لے آیا اور چھوٹے چھوٹے وقفوں میں دانہ بکھیرنے لگا۔ صبح جو چڑیاں اور ننھے پرندے آیا کرتے تھے وہ اب یہ دانہ کھا سکیں گے۔ بڑا بھائی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"اگر انہیں کوئی بلی یا اور جانور کھا گیا تو؟ باہر کی دنیا پرندوں کے لیے خطرناک ہوتی ہے"

اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ شاید وہ اس رحم دل لڑکے کو ڈرانا چاہتا تھا۔

چھوٹے کے ننھے ہاتھ مٹھی بھر بھر کر دانہ اچھال رہے تھے.... جیسے کوئی فرمانروا اپنی رعایا کے لیے خیرات بکھیر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر سکون جھلک رہا تھا۔

"موت سب کے مقدر میں ہے۔ جسے جیسے، جہاں موت آنی ہوئی اسے ویسے اور وہیں موت آئے گی۔ اس کے بارے میں فکر مند نہیں ہوتے" وہ قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ ساری تھیلی خالی ہو چکی تھی۔

بڑے بھائی نے اب کچھ نہ کہا۔ وہ صرف دیکھتا رہا۔ اسے اب سمجھ آیا کہ اس کا بھائی اپنے باپ کے ساتھ اتنا وقت کیوں گزارتا ہے۔ یہ دانش، یہ گہرائی اسے ان لمحات سے ملی تھی۔ اسے فہم حاصل تھا اور اسی لیے وہ جواب دے پاتا تھا۔ بڑا بھائی خاموشی سے اس کے ساتھ آ بیٹھا۔ پرندوں کے جانے کا افسوس تھا لیکن اب وہ افسوس بیکار محسوس ہو رہا تھا۔

جیسے ہی ان دونوں کی آوازیں مدھم ہوئیں رات کی دبیز خاموشی دوبارہ لان پر اتر آئی۔

اور وہ جو کب سے فاصلے پر کھڑا تھا سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ دماغ میں اس کا خیال آیا جسے اس نے بہت دنوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ وجود بھی ان پرندوں کی طرح ہی اس سے دور جا چکا تھا۔ آنکھیں بے ساختہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو ترسنے لگیں۔

اس کا ارادہ ان کی باتیں سننے کا نہیں تھا۔ مگر اب جو سن لیا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں کیا تھا۔

"اندر چلتے ہیں۔ ورنہ ڈیڈ ہمیں اتنی دیر تک جاگتا دیکھ ناراض ہوں گے"

چھوٹا لڑکا چھلانگ مار کر بینچ سے نیچے اترا۔ بڑے بھائی نے بھی خاموشی سے اس کی پیروی کی۔ دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔

لان اب خالی ہو چکا تھا۔ مگر وہ اب بھی وہیں دیکھ رہا تھا... جہاں سے وہ دونوں گئے تھے۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

ڈھوانی چھت والے گھر میں وہ متوازن قدموں سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھام کر اترتے ہوئے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن وہ چھٹی نہیں کر سکتا تھا۔

رات کلارا کا فون سننے کے بعد وہ سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس کی نیند اگر ایک بار ٹوٹ جاتی تھی تو سونا بے حد مشکل ہو جاتا تھا۔ نیند نہ آنے پر اس نے لائبریری سے لائی گئی کتاب اٹھالی۔ پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کب رات سے دن ہوا اور کب اندھیرے سے اجالا بکھرا۔

اپنی بھاری ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے اس نے آخری زینے پر پاؤں رکھا اور کچن میں آ کر کاؤنٹر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچن کے بیچ و بیچ بنا وہ کاؤنٹر اتنا وسیع تھا کہ اسے ڈائننگ ٹیبل کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ وہ ڈریس پینٹ اور شرٹ پہنے آفس جانے کے

لیے مکمل تیار بیٹھا تھا۔ کوٹ وہ آتے ہی کرسی کی پشت پر جما چکا تھا۔ جبکہ بریف کیس باہری صوفے پر رکھ آیا تھا۔

سامنے مسٹر مارکس کھڑے تھے جو جگ میں اپنے کچن گارڈن کے اگے پھل ڈال کر گرائنڈر چلا چکے تھے۔ انہوں نے آج بھی سالوے کے آنے پر کسی طرح کا کوئی رد عمل نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی بھی اس کی موجودگی سے نہیں چونکتے تھے۔

سالوے خاموشی سے انہیں دیکھے گیا۔ اپرین باندھے مسٹر مارکس سنجیدہ تھے۔ سالوے اکثر سوچتا تھا کہ شاید وہ بھی بوڑھا ہو کر مسٹر مارکس کی طرح کا ہی لگے گا۔ آخر بیٹا تھا تو نین نقش بھی انہی کے چرائے ہوئے تھا۔

اس نے کاؤنٹر کے ایک طرف رکھے آملیٹ اور کافی کو دیکھا۔ یہ یقیناً لیو بنا کر گیا ہو گا۔ اسے سالوے نے ہی ہائر کیا تھا۔ صبح، دوپہر، رات تینوں وقت کا کھانا وہی بناتا تھا۔ نہ تو سالوے کو کھانا بنانا آتا تھا اور نہ ہی مسٹر مارکس کو۔ مسٹر مارکس تو پھر بھی ایک ڈش بنا لیتے تھے۔ لیکن سالوے کو تو انڈہ تک ابالنا نہیں آتا تھا۔ اپنے اس پھوہڑ پن کے باوجود بس ایک چیز تھی

Clubb of Quality Content

جو وہ بہت اچھی بنا تا تھا۔ اور وہ تھے پاپ کارن ۔ وہ طرح طرح کے پاپ کارن بنا سکتا تھا ۔ لیکن اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر خاموش ہو گیا۔

مسٹر مارکس دو دنوں سے خاموش تھے۔ وہ اسے "ہاں"، "ہوں" سے زیادہ جواب نہیں دیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ناراض تھے۔ بس جب کبھی وہ اداس ہوتے تھے تو وہ بولنا چھوڑ دیتے تھے۔

"شاید آج کل ان کا اداس ہونے کا سیشن چل رہا ہے "اس نے دل میں سوچا۔ پھر اونچی آواز میں گلا کھنکھارا۔

مسٹر مارکس گرائنڈر بند کر کے سٹرابیری شیک اب گلاس میں انڈیل رہے تھے۔ ایک ڈش کے ساتھ انہیں اور بہت سی ڈرنکس بھی بنانی آتی تھی۔

"پاپا" بلآخر اس نے اپنی ہمت مجتمع کرتے انہیں پکارا۔

مسٹر مارکس کا ملک شیک انڈیلتا ہاتھ وہیں تھم گیا۔

Clubb of Quality Content

"میرے لیے بھی شیک ڈال دیں" اس نے نہایت بے تکی بات کی تھی۔ مسٹر مارکس نے سر ہلایا اور قریب رکھے اسٹینڈ پر لٹکا ایک اور گلاس اٹھالیا۔

اب وہ اس کے گلاس میں سٹرابیری شیک انڈیل رہے تھے۔ کانچ کی ٹرانسپیرنٹ سطح مائع اندر جانے سے گلابی ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد سالوے کے مقابل، کاؤنٹر کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھتے انہوں نے ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اور اپنا گلاس بغیر کسی تردد کے منہ سے لگالیا۔ نگاہیں کھڑکی سے باہر تھیں، اور ذہن خاموشی کے سمندر میں غرق۔

ان کے سامنے بیٹھا سالوے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائے، اپنے سامنے رکھے گلاس کو تکتا رہ گیا۔ پیندے میں گلابی رنگ کا مشروب تیر رہا تھا جو کم از کم اس کے لیے کسی زہر سے کم نہیں تھا۔

"پاپا؟" اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وہ کبھی گلاس کو دیکھتا تو کبھی اپنے باپ کو۔

"آپ مجھے یہ کیسے دے سکتے ہیں؟" اسے اپنی آواز ہی اجنبی لگی۔

"آپ مجھے سٹرابیری شیک دے رہے ہیں؟ آپ بھول گئے ہیں کہ مجھے سٹرابیری سے الرجی ہے؟"

مسٹر مارکس اپنا گلاس خالی کر کے رکھ چکے تھے۔انہوں نے بے تاثر آنکھیں اٹھائیں، سالوے کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا، پھر نظر گلاس پر ٹھہر گئی جو اس کے سامنے رکھا تھا۔

"تم نے مانگا... اور میں نے دے دیا۔ آگے مرضی تمہاری ہے کہ تم یہ پینا چاہتے ہو یا پھینکنا" کندھے اچکا کر وہ پرسکون سے بولے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔سالوے کو لگا جیسے انہوں نے اسے تھپڑ کھینچ مارا ہو۔

Clubb of Quality Content

اتنا اجنبی رویہ؟ وہ انکا بیٹا تھا۔ اکلوتا بیٹا۔ ان کی لاڈلی بیوی کا بیٹا جس کے لیے وہ آج بھی آنسو بہاتے تھے۔ پھر کیسے وہ اتنے اجنبی ہو سکتے تھے؟

اس کا دل زخمی ہونے لگا۔ صبح کی ساری تازگی ناخوشگواری میں بدل گئی تھی۔

اگلے ہی لمحے اس نے کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ جمائے، کرسی دھکیلی، کھڑا ہوا، اور کرب سے بھرپور نظروں سے ان کے بے حس چہرے کو دیکھا۔

"ایم سوری، ڈیڈ"

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ بلکہ بغیر ناشتہ کیے کچن سے نکل گیا۔

باہر آ کر اس نے صوفے پر سے اپنا بریف کیس اٹھایا... دروازے کے ساتھ لگی ہک سے چابی اتاری اور دہلیز پار کرتے گھر سے رخصت ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد اس کے زن سے گاڑی بھگانے کی آواز پوری کالونی میں گونجی تھی۔ وہ آخری حد تک تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔

کچن میں بیٹھے مسٹر مارکس خاموش تھے۔ انہوں نے کھڑکی کے پار بیٹھے پرندے کو دیکھا جو پانی کے پیالے میں چونچ ڈال کر آب کے قطرے اپنے حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔

میز پر رکھی سالوے کی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ آملیٹ پڑا پڑا اکڑ چکا تھا۔ انہوں نے سٹرا بیری شیک کا گلاس اٹھایا۔ اس پر یقیناً سالوے کا نام نہیں لکھا تھا۔ اس وجہ سے وہ اسے پی نہیں سکا۔ اس پر مسٹر مارکس کا نام لکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے انہوں نے وہ گلاس بھی خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

برتن سمیٹنے، کافی سنک میں گرانے اور آملیٹ یونہی ایک طرف رکھنے کے بعد وہ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے برتن دھونے لگے۔

اس کے بعد انہیں اپنے برتنوں کو بھٹی میں پکانا تھا۔ پھر گارڈن کا خیال رکھنا تھا۔ قریبی چند دکانوں پر اپنے برتنوں کے آرڈر کو پورا کرتے انہیں وہاں پہنچانا تھا۔

اپنی روٹین کی ساری فہرست انہیں یاد تھی۔ لیکن وہ بس ایک چیز بھول گئے تھے۔ سالوے ہمیشہ انہیں "پاپا" کہہ کر پکارتا تھا۔ آج ڈیڈ کہہ کر گیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اندر کہیں ننھا سالوے کھو چکا تھا۔ اور وہ اس بات سے بے خبر تھے۔

...✧......✧......✧......✧......✧...

سڑکوں پر ان گنت دوڑتی گاڑیوں میں ایک وہ سفید رنگ کی گاڑی بھی تھی جو فراٹے بھرتے ہوئے تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سالوے سپاٹ بیٹھا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی تھی اور اسٹیرنگ پر دھرے ہاتھوں کی ابھری نسیں اس کے اندر پھیلے انتشار کی نشاندہی کر رہیں تھی۔ وہ پوری رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ بغیر رکے، بغیر جھجکے۔

اول تو اسے کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ وہ لڑنے جھگڑنے والوں میں سے تھا ہی نہیں۔ لیکن آج اس کا دل کر رہا تھا وہ چیخے، چلائے۔

اس کے باپ نے اسے اجنبی کر دیا تھا۔ کیا وہ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا؟ وہ کیوں اس کی صحت کا بھول کر اسے زہر پیش کر رہے تھے؟ وہ یہ سوال چیخ چیخ کر کرنا چاہتا تھا۔

اس کے باپ نے آج سے پہلے اس سے اتنی لاپرواہی کبھی نہیں برتی تھی۔ لیکن آج وہ اسے چپ کی مار مار رہے تھے۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ اب انہیں برتن سازی سے منع نہیں کرے گا۔ وہ چاہے جو مرضی کریں وہ انہیں کبھی نہیں روکے گا۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا۔ لیکن وہ اس کی ایک غلطی پر اس کی پہچان چھین رہے تھے۔ وہ اس سے اس کا باپ چھین رہے تھے۔

اسے یاد تھا بچپن میں جب اس کے نانا نے غلطی سے اسے سٹرابیری کھلادی تھی تو اس کی حالت بگڑنے پر مسٹر مارکس اپنا آپ بھلا بیٹھے تھے۔ اسکے بعد انہوں نے زندگی میں کبھی بھی اسے سٹرابیری نہیں کھانے دی تھی۔ لیکن آج وہ یہ سب کیوں بھول گئے تھے؟

اس کی بھوری آنکھوں میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں تھیں۔ وہ چاہے جتنا مرضی بڑا ہو جائے لیکن اپنے باپ کے معاملے میں ہمیشہ بچہ ہی رہے گا۔

انہی بے پایاں سوچوں میں گم، یونیورسٹی کے سامنے آتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی کو روکا۔ رات جس وجہ سے وہ سو نہیں سکا اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے اس نے خود کو کمپوز کیا اور سیٹ بیلٹ کھولتے، ڈیش بورڈ پر رکھا اپنا فون اٹھا لیا۔ اب وہ کال لاگ میں رات والے نمبر کی کال تلاش کر رہا تھا۔ اسے زیادہ سکرولنگ نہیں کرنی پڑی۔ جلد ہی اسے وہ کال نظر آ گئی اور اس نے گہری سانس بھرتے کال بیک ملا دی۔

گھنٹی جا رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے فون نہیں اٹھایا گیا۔

ایک...دو... تین...چار

وہ مسلسل کال ملا رہا تھا۔ لیکن جواب ندارد۔

اس کا سر درد سے پھٹنے کے قریب تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور مسٹر مارکس کا دکھ الگ تھا۔ اس کا دل کیا اس دنیا سے غائب ہو جائے۔

"ہیلو" ساتویں کال پر نسوانی آواز سنائی دی۔

یونیورسٹی گیٹ کے قریب کھڑی، اپنی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کلارا نے مطمئن ہوتے سر پر ترچھی ٹوپی درست کی۔ آخر اس کا انتظار ختم ہوا تھا۔

رات اس نے چھ کالز کی تھی۔ اور سالوے نے سات۔ اس کا پلڑا بھاری تھا۔ اور اس کے نزدیک یہ اچھی بات تھی۔

اس وقت اس نے لمبا سفید رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور سالوے کا آئی ڈی کارڈ اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

" کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ مجھے آپ کہاں ملیں گی، مس انونمس؟" وہ بمشکل بول پایا۔

ورنہ دل کر رہا تھا آگ لگا دے اس کارڈ کو۔ آج کا دن ہی منحوس تھا۔

ٹیک چھوڑ کر کلارا ذرا سیدھی ہوئی۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ اور کندھے پر لٹکتے بیگ کو ٹھیک کیا۔

"قسمت نے چاہا تو ایک آدھ جھلک دکھا ہی دوں گی، مسٹر سالوے "اس نے نہایت اطمینان سے سالوے کی جلتی دنیا پر پیٹرول چھڑ کا تھا۔ ساتھ میں آئی ڈی کارڈ ہوا دینے والے انداز میں جھلانے لگی۔

اور وہ جو پہلے ہی جلتے کوئلوں پر سلگ رہا تھا، اس کا چہرہ یکلخت سرخ پڑا۔ نظریں فرنٹ گلاس پر جمیں تھی۔ پھر وہ جھٹکے سے گاڑی کادروازہ کھول کر باہر نکلا۔

اس کے قدموں میں برق رفتاری تھی۔ تیزی چیتے جیسی۔

"اور میرانام مس انونمس نہیں، کلارا ہے" اس نے مزید کہتے جتایا۔ پھر نزاکت سے کھلے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا۔

آس پاس سٹوڈنٹس یونیورسٹی کے اندر جارہے تھے۔ اس کی کلاس کا بھی وقت ہو گیا تھا۔ لیکن وہ آرام و فرصت سے کھڑی اسے زچ کر رہی تھی۔

"مس انونمس؟"

"کہا ناں... میں مس انونمس نہیں ہوں" وہ دانت پر دانت جما کر دبی دبی آواز سے بولی۔ کتنا برا نام تھا یہ۔ جیسے کسی ایلین یا گمنام مخلوق کی طرف اشارہ کیا جارہا ہو۔

" Thanks, Miss Anonymous"

اس بار آواز دو طرف سے آئی تھی۔ ایک بار موبائل سے... اور دوسری بار اس کے کندھے کے قریب سے۔

اگلے ہی لمحے اس کا جھلاتا ہوا ہاتھ خالی تھا۔ آئی ڈی کارڈ وہ کسی شکاری کی طرح اس کے ہاتھ سے اچک چکا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے گردن موڑی تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ چھلاوے کی طرح غائب ہوا تھا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

فون ابھی بھی اس کے کان سے لگا تھا۔ اب دوسری جانب سے گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی بھاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ رابطہ جان بوجھ کر منقطع نہیں کیا گیا تھا۔ اچانک ایک چبھتی ہوئی آواز نے اس کی سماعت پر حملہ کیا۔

"آپ کا سٹوڈنٹ کارڈ زمین کو سلامی دے رہا ہے۔ اٹھا لیجیے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اسے بھی میرے آئی ڈی کارڈ کی طرح لے اڑے... مس انونمس" طنز کے اس زہر میں بجھے جملے

کے بعد سالوے نے فون کاٹ کر ڈیش بورڈ پر دے مارا۔ اس کا دماغ اب بھی کھول رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے والی گاڑی کے قریب کھڑی اسی کا کارڈ ہاتھ میں لے کر اسے چڑا رہی تھی۔

کیا وہ اسے اندھا سمجھتی تھی؟... ہونہہ

گنگ کھڑی کلارا نے فوراً سے پہلے جھک کر اپنا کارڈ اٹھایا تھا اور اسے جھاڑ کر اس کی لمبی سرخ ڈوری کو گلے میں لٹکا لیا۔ یہ کارڈ شاید بے دھیانی میں اس کی جیب سے گر گیا تھا۔

دل تو اس کا کہہ رہا تھا کہ کاش آئی ڈی کارڈ واپس کرنے کی بجائے اس رات کھڑکی سے باہر ہی پھینک دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایسے بے مروت انسان کی مدد کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی۔

جلتے کڑھتے دل کے ساتھ اس نے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کی اور یونیورسٹی کے اندر داخل ہو گئی۔

سورج کی روشنی میں اس کے کندھے پر لٹکا سفید موتیوں سے سجا بیگ چمک رہا تھا جس پر ابھری ہوئی سنہری دھاگے سے کشیدہ کاری میں C نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے تقریباً ہر بیگ پر C کا حرف ضرور کندہ تھا۔ یہ اس کی ملکیت ظاہر کرنے کا بہت واضح اشارہ تھا۔

ایک لمحے کو اس نے کلائی پر بندھی سلور واچ پر نظر دوڑائی۔ سوئیاں جیسے طنزیہ انداز میں اسے یاد دلا رہی تھیں کہ کلاس شروع ہوئے دس منٹ سے بھی اوپر ہو چکے ہیں۔ اس نے ہلکی سی آہ بھری اور سنیکرز میں قید اپنے قدموں کو زمین سے ہم آہنگ کیا کر دیا۔ دیر تو اسے ہو چکی تھی۔ لیکن اب اسے جلدی پہنچنا تھا۔

پتھریلی روش پر چلتے ہوئے اس کے قدموں کی چاپ خاموشی کو چیرتی جا رہی تھی۔ درختوں سے چھنتی دھوپ اور اس کے سائے کے بیچ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچی۔ کلاس روم کے دروازے پر لمحے بھر کو رکی، سانس بحال کیا، پھر دھیرے سے اندر داخل ہوئی۔

پروفیسر کا چہرہ بورڈ کی طرف تھا اور یہ کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے آخری خالی کرسی پر بیٹھی، بیگ میز پر رکھا، اور اس کا ہک کھول کر اپنا آئی پیڈ نکال لیا۔

اس کی آہٹ پاتے ہی اگلی سیٹ پر بیٹھی اس کی دوستیں گردن موڑ کر کے اسے دیر سے آنے پر گھورنے لگیں۔ لیکن وہ پوری سنجیدگی سے اسٹائلس تھامے ہر وہ نقطہ نوٹ کرنے لگی جو سر کی آواز سے ترتیب پا رہا تھا۔

اس وقت وہ یکسر بدل چکی تھی۔ زچ کرنے والی کلارا کہیں غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک متوجہ، متفکر اور علم کی پیاسی کلارا کی روح اس کے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔

جاری ہے

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

مزید بہترین ناول/افسانے/آرٹیکل/مختصر کہانیاں اور معیاری شاعری پڑھنے کے لئے

نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کریں۔

شکریہ!

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

www.novelsclubb.com

ہماری ایپ ڈاؤنلوڈ کریں اور رسائی حاصل کریں بے شمار مزے دار ناولوں تک

Download our app

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842